پیش لفظ از رچرڈ ڈاکنز

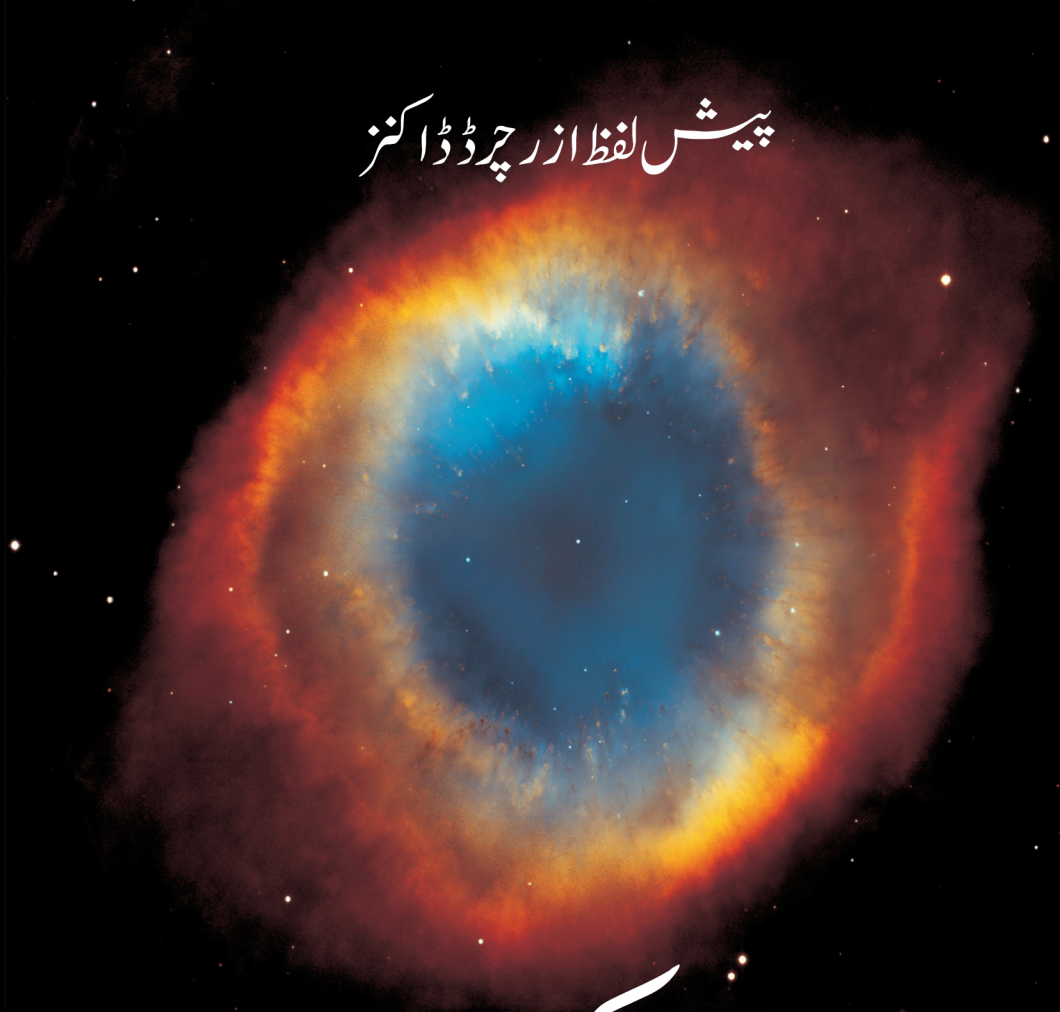

خدا کیوں

جے اینڈرسن ٹامسن جونیئر، ایم ڈی

ہمراہ کلیئر اوکوفر

خدا کیوں؟

عقیدے کی سائنس کا مختصر تعارف

جے اینڈرسن ٹامسن، جونیئر، ایم ڈی

اور کلیر اوکوفر

جملہ حقوق محفوظ ©

اشاعت : 2013

کتاب : خدا کیوں

مصنّفین : جے اینڈرسن ٹامس جونیئر، ایم ڈی
ہمراہ کلیئر اوکوفر

تزئین : عبدالحفیظ

قیمت : **250** روپے

مطبع : بی بی ایچ پرنٹرز، لاہور

Why We Believe in God(s)

J. Anderson Thomson, Jr., MD
with Clare Aukofer

Urdu edition - 2013

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلّہ، امین پور بازار، فیصل آباد

میرے پوتے جیک کے لیے

اس اُمید پر کہ وہ مذہب کی تباہ کاریوں

سے آزاد دُنیا میں پروان چڑھے گا

فہرست

- پیش لفظ: رچرڈ ڈاکنز 11
- تمہید 16
- حرفِ سپاس 21
- تشکّر 22

1۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا: اعتقاد کی طرف ہمارا میلان 27

2۔ شکل و شباہت: ارتقا کی الف بے 34

3۔ ہماری روزانہ کی روٹی: رکھوالے کی تمنا 42

4۔ دید و نادید: روحوں کا تصور 49

5۔ چونکہ آسمانی کتاب کہتی ہے: نادید پر یقین رکھنا 52

6۔ اور ہمیں شر سے بچا: خدا کو انسانی چولا پہنانا 60

7۔ تمھاری آرزو پوری کی جائے گی: خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا 70

8۔ جب بھی تم میں سے دو یا دو سے زیادہ اکٹھّے ہوں: مذہبی رسوم کے ذریعے دماغی کیمسٹری کا استعمال 78

9۔ اے ایمان والو: ذیلی پیداوار کے طور پر خدا کا جسمانی ثبوت 99

10۔ کہیں تمھارا امتحان نہ لیا جائے: دماغوں کی تربیت 106

- نوٹس 110
- فرہنگ 142

تصاویر

☆ انسانی دماغ، جانبی رخ

☆ انسانی دماغ، مڈسیجیٹل رخ

پیشگی تعریف

'شوقیہ ترکھان کے طور پر میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی کام کے لیے مناسب اوزار کا ہونا انتہائی اہم ہے۔ اس کتاب کی شکل میں اینڈی ٹامسن اور کلیر اوکوفر نے ایک عام شخص کے لیے اوزاروں کا ایک ایسا صندوق پیش کر دیا ہے جس کی مدد سے ایک عام شخص بھی مذہب کی ابتدا کے بارے میں زیادہ شفاف طریقے سے سوچ سکتا ہے۔' اگسٹ ای برنز مین چہارم، ایگزیکٹیو ڈائریکٹر، سیکولر سٹوڈنٹ الائنس

'یہ کتاب مذہب کی سب سے متاثر کن سائنسی تفہیم فراہم کرتی ہے۔ اینڈی ٹامسن اور کلیر اوکوفر بہت صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ ارتقاشدہ نفسیاتی اور ذہنی مکینزموں نے مل کر مذہبی تجربے کو وضع کیا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ مذہبی رہنما کیسے ان مکینزموں کو استعمال کرتے ہیں، جن کے بعض اوقات تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اول تا آخر مسحور کن ہے۔ یہ 2011ء کے لیے میری سفارش کردہ کتابوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ ڈیوڈ ایم بس، مصنف The New Science of the Mind: Evolutionary Psychology

’سائنس، ٹیکنالوجی اور طب کی تمام تر ترقیوں کے باوجود ہماری قدیم نفسیات ہمیں متروک عقائد، اندھے یقین اور قبائلی تنازعات میں گھسیٹے چلی جا رہی ہے۔ اینڈی ٹامسن اور کلیر اوکوفر نہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ انسانی دماغ کیوں ناقابلِ یقین چیزوں پر یقین رکھتا ہے، بلکہ یہ بھی کہ ہم اس کے لیے مرنے مارنے پر کیوں تل جاتے ہیں۔ یہ کتاب پڑھیں، اور جب پڑھ چکیں تو پھر اپنے کانگریس کے نمائندے کو بھیج دیں۔‘ آرالیز بیتھ کورنویل، پی ایچ ڈی، ایگزیکٹیو ڈائریکٹر، رچرڈ ڈاکنز فاؤنڈیشن فار ریسرچ اینڈ سائنس

’جیسا کہ اینڈی اور کلیر اوکوفر نے اپنی مختصر مگر موثر کتاب میں بیان کیا ہے، ہمارے پلک جھپکتے میں کیے گئے فیصلے لاکھوں برس کے عمل کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ یہی حال انسان کی دیوتا تخلیق کرنے اور اس پر یقین رکھنے کی صلاحیت کا بھی ہے۔ وہ مختلف مطابقتیں جو مذہبی اعتقاد کو جنم دیتی اور قائم رکھتی ہیں، ان کا اس سے بہتر اور جامع کوئی اور خلاصہ میری نظر میں نہیں ہے۔۔۔‘ سارا بی ہرڈی، مصنّفہ
Mother Nature and Mothers and Others: The Evolutionary Origins of Mutual Understanding

’میں نے دیکھا ہے کہ عوامی پالیسی سازی میں ہمیں کس شدت سے منطقی سوچ کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب، جو مطلق مسائل پر بحث کرتی ہے، اسے زیادہ منطقی تصورِ کائنات تعمیر کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔۔۔‘ شان فیئر کلاتھ، ایگزیکٹیو ڈائریکٹر، سیکیولر کوالیشن فار امیریکا

’انسانی ذہن ایک نادیدہ خدا پر ایمان کس طرح پیدا کرتا ہے؟ خودکش دہشت گردی پر تحقیق کے دوران ماہرینِ نفسیات اینڈی ٹامسن اور کلیر اوکوفر نے بہت خوبصورتی سے انسانی ذہن کی بہت سی پیدائشی خصوصیات بیان کر کے یہ واضح کیا ہے کہ ہم کیسے ایک ناقابلِ ادراک مظہر یعنی خدا پر یقین رکھ سکتے ہیں۔ ان کی تحریر شفاف، واضح، پر علم، انتہائی عاقلانہ، اور ذہن کی کارکردگی کے بارے میں نئے سائنسی حقائق سے مالا مال ہے۔ یہ موضوع ہم سب کی زندگیوں

پر اثر انداز ہوتا ہے: ان لوگوں سے لے کر، جو ایر پورٹ کی سیکیورٹی قطار سے گزرتے ہیں، ان تک مذہبی جبر کے اندر زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے اپنے ہمسائے کو جانو۔ اینڈی اور اوکوفر نے ہمیں ایک دانش مندانہ کتاب پڑھنے کو دی ہے۔' ہیلن فشر، پی ایچ ڈی، حیاتیاتی ماہرِ بشریات، رٹگرز یونیورسٹی، اور مصنّف Why Her? Why Him?

'برین واش؟ اینڈی ٹامسن اور کلیر اوکوفر نے کھول کر بیان کیا ہے کہ ہم مذہبی عقائد کے لیے اس قدر زد پزیر کیوں ہیں۔ پادری، ربائی، اور امام ہمیں رقص کرواتے ہیں، اور پھر ہمیں ورغلاتے ہیں۔۔۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہمارے اندر ورغلائے جانے کا قدرتی میلان موجود ہے۔ خدا کیوں؟ ایک آسان اور دلچسپ کتاب ہے (اور اس میں تصویریں بھی ہیں۔) کوئی تعجّب نہیں ہے کہ اتنے زیادہ لوگ جادو کی کہانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔' ووڈی کیپلین، Chair, Advisory Board of the Secular Coalition for America, and President, Defending Dissent Foundation

'ایک مسحور کن سوال پر حالیہ تحقیق کا بے حد ضروری خلاصہ۔ بہت سے مذہبی لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر مذہب سچا نہیں ہے تو پھر موثر کیوں ہے۔ یہ کتاب اس سوال کا جواب فراہم کرتی ہے۔۔۔' امینڈا کے کیٹسکیس، ایگزیکیٹیو ڈائریکٹر، کیمپ کوئسٹ۔

'اہم سب کے ذہنوں کے اندر کا ایک مہم جویانہ اور معلومات افزا سفر۔ وہ ذہن جو یقین لانے کے لیے ڈھالے کیے گئے ہیں۔ اینڈی ٹامسن اور کلیر اوکوفر ہمیں ایک ایسے ہی سفر پر لے جاتے ہیں جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کیسے انسانی دماغ قدیم زمانے میں پروان چڑھا اور کیسے مذہب نے ان مطابقتوں کو جدید زمانے کے لیے ڈھال لیا۔۔۔'

ٹاڈ سٹیفل، صدر، سٹیفل فری تھاٹ فاؤنڈیشن

●●●

پیش لفظ

—رچرڈ ڈاکنز—

چارلز ڈارون نے انتہائی انکسار سے کام لیتے ہوئے اپنی کتاب ''دی اوریجن آف سپیشیز'' (انواع کی ابتدا) میں انسانی ارتقا کو ایک کم آمیز پیش گوئی میں محدود کیا ہے: ''انسان کے آغاز اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے گی۔'' اس پیراگراف کا ابتدائی فقرہ کم کم نقل کیا جاتا ہے: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل بعید میں کہیں زیادہ اہم تحقیق کے نئے نئے میدان کھلیں گے، اور نفسیات ایک نئی بنیاد پر کھڑی کی جائے گی۔''

ڈاکٹر ٹامسن ان ارتقائی نفسیات دانوں میں سے ہیں جو اس پیش گوئی کو درست ثابت کر رہے ہیں۔ ارتقا کے مذہبی عوامل کے بارے میں ان کی کتاب دیکھ کر یقیناً ڈارون کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ ڈارون اگرچہ پکی عمر کو پہنچنے کے بعد مذہبی نہیں رہے تھے، لیکن وہ مذہبی جذبے کو سمجھتے ضرور تھے۔ وہ ڈاؤن چرچ کے سرپرستوں میں سے ایک تھے اور اتوار کی اتوار اپنے خاندان کو چہل قدمی کراتے ہوئے باقاعدگی سے وہاں لے کر جایا کرتے تھے (جب خاندان چرچ کے اندر چلا جاتا تو وہ اپنی چہل قدمی جاری رکھتے۔) انھوں

نے پادری بننے کی تعلیم حاصل کی تھی، اوران کے انڈر گریجویٹ زمانۂ طالب علمی کی پسندیدہ کتاب ولیم پیلی کی ''نیچرل تھیالوجی'' (فطری دینیات) رہی تھی۔ اگر چہ ڈارون نے نیچرل تھیالوجی کے پیش کردہ ''جواب'' کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا، تاہم ان کی اس ''سوال'' میں دلچسپی کبھی ختم نہیں ہوئی: اور وہ سوال ہے فعل کا۔ اس میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ مذہبیت کا مقصدی سوال انھیں اکساتا رہتا تھا۔

اکثر لوگ، اور تمام قومیں مذہبی عقائد کے پروردہ کیوں ہوتے ہیں؟ اس ''کیوں'' کو آج کے اس مخصوص مقصدی تناظر میں بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے، جسے ہم، لیکن ڈارون خود نہیں، ''ڈارونزم'' کہتے ہیں۔

ڈارون کے سوال کو جدید اصطلاحات کی مدد سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مذہبیت کس طرح ان جینز کی بقا میں مدد دیتی ہے جو اس کا پرچار کرتے ہیں؟ ٹامسن اس ''ذیلی پیداوار'' (بائی پراڈکٹ) مکتبۂ فکر کے نمایاں محرک ہیں: یعنی بقا کے لیے مذہب کی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ ان نفسیاتی رجحانات کی ذیلی پیداوار ہے جو بقا کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔

''فاسٹ فوڈ'' اس کتاب کی زیریں رو ہے: ''اگر آپ فاسٹ فوڈ کی نفسیات سمجھتے ہیں تو آپ مذہب کی نفسیات بھی سمجھ لیں گے۔'' ایک اور عمدہ مثال چینی کی ہے۔ ہمارے جنگلی آباؤ اجداد کے لیے اسے زیادہ مقدار میں حاصل کرنا ناممکن تھا۔ چناں چہ ہمیں اس کی شدید طلب ورثے میں ملی ہے۔ اور اب جب کہ یہ با آسانی دستیاب ہے، یہ ہماری صحت کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

فاسٹ فوڈ کی یہ طلب ذیلی پیداوار ہے۔ اب یہ قابو سے باہر ہونے کی وجہ سے نقصان دہ ہو چکی ہے، اور ایسے طبی مسائل کا باعث بن رہی ہے جن کا ہمارے آبا کو کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ یہ بات ہمیں دوبارہ مذہب کی طرف لے کر آجاتی ہے۔

ایک اور نمایاں ارتقائی نفسیات دان سٹیون پنکر موسیقی کو اسی طرح کی ''ذیلی پیداوار''

قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ موسیقی ایک قسم کا ''سمعی کیک ہے جسے ہماری کم از کم چھ مختلف ذہنی صلاحیتوں کے حساس کونوں کو گدگدانے کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے۔'' پنکر کے نزدیک موسیقی کی طرف سے ذیلی پیداوار کے طور پر گدگدائی جانے والی ذہنی صلاحیتوں کا زیادہ تر تعلّق اس دماغی سافٹ ویر سے ہے جو پس منظر کے شور سے بامعنی آوازوں (یعنی زبان) کو الگ کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

تاہم ٹامس کی مذہبی فاسٹ فوڈ کا نظریہ ان نفسیاتی رجحانات پر زور دیتا ہے جنہیں سماجی رجحانات کہا جاسکتا ہے: ''اختیار کردہ نفسیاتی عوامل جن کا اس لیے ارتقا ہوا ہے کہ ہمیں دوسرے لوگوں کے ساتھ باہمی تعلّقات، مقصد اور نیت کا تعین کرنے، اور تحفّظ کا احساس پیدا کرنے میں مدد دے سکیں۔ یہ عوامل ہمارے افریقی وطن میں ماضی قریب میں ڈھالے گئے تھے۔''

ٹامسن کی کتاب میں ایسی کئی ارتقا شدہ ذہنی صلاحیتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا مذہب نے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کو آسمانی یا مذہبی نام دے دیا ہے: ''ہماری روزانہ کی روٹی''، ''ہمیں شر سے بچا''، ''تیری خواہش کی تعمیل ہوگی''، ''تاکہ تمہارا امتحان لیا جاسکے۔'' ایسے ہی چند مؤثر مناظر ملاحظہ ہوں:

ایک دوسالہ بچے کا تصور کیجیے جو چاہتا ہے کہ اسے گود میں اٹھایا جائے اور لاڈ پیار کیا جائے۔ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے اور آپ سے التجا کرتا ہے۔ اب یومِ خمیس کے ایک پجاری کا تصور ذہن میں لائیے جو زبانیں بولتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے، اور خدا سے اسی ''مجھے اپنی گود میں اُٹھالو'' کے انداز میں التجا کرتا ہے۔ ہم دوسرے انسانوں کے ساتھ موت، اختلافات، یا فاصلے کی وجہ سے تعلّق توڑ سکتے ہیں، لیکن خدا ہر وقت ہماری خاطر ہمارے پاس موجود رہتا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کو پجاری کا ہاتھ اٹھانے والا انداز بے وقوفانہ سا لگتا ہے۔ ٹامسن کو پڑھنے کے بعد ہم اسے زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں گے: یہ بے وقوفانہ نہیں

بلکہ بچگانہ ہے۔اس کے علاوہ ایک اور چیز ہمارا ہر چیز کے پیچھے فاعل یا عامل کا ہاتھ دیکھنے کی خواہش ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ آپ کو سائے پر چور کا گمان ہوتا ہے، لیکن چور پر کبھی بھی سائے کا گمان نہیں ہوتا؟ اگر آپ دروازہ بند ہونے کی آواز سنیں تو ایسا کیوں ہے کہ آپ ہمیشہ پہلے یہ سوچتے ہیں کہ دروازہ کس نے بند کیا ہے، بہ نسبت اس کے کہ ہوسکتا ہے کہ دروازہ ہوا سے بند ہوگیا ہو۔ایسا کیوں ہے کہ ایک بچہ درخت کی ہلتی ہوئی شاخوں کو اپنی کھڑکی سے دیکھ کر خوف سے دبک جاتا ہے کہ بھوت اسے پکڑنے آرہا ہے۔

ہمارے اجداد کے ذہنوں میں ہر چیز کے پیچھے کسی عامل کو تلاش کرنے والا ضرورت سے زیادہ سرگرم آلے کا ارتقا نفع نقصان کو بھانپنے کے عدم توازن کی وجہ سے ہوا ہے۔ شماریاتی طور پر اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ گھاس میں سرسراہٹ کا باعث ہوا ہوگی، نہ کہ شیر۔لیکن دونوں میں سے ایک غلطی کی قیمت دوسری سے کہیں زیادہ ہے۔شیر یا چور ایسے عوامل ہیں جو آپ کو ہلاک کرسکتے ہیں۔چناں چہ بہتر یہی ہے کہ شماریاتی طور پر کم امکان والا اندازہ اپنایا جائے۔(خود ڈارون نے بھی ہوا سے اڑ جانے والی چھتری پر اپنے کتے کے ردِعمل پر یہی بات کی تھی۔) ٹامسن اسی خیال کو آگے بڑھاتا ہے۔۔۔یعنی ناموجود عوامل کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی حساسیت۔۔اور ہمیں ان نفسیاتی بنیادوں کی ایک اور عمدہ تفہیم فراہم کرتا ہے جن پر مذہبیت قائم کی گئی ہے۔

رشتوں کے بارے میں ہمارا ڈارونی انہماک ایک اور مثال ہے۔مثال کے طور پر رومن کیتھولک روایت میں ننوں کو ''سسٹر'' حتیٰ کہ ''ماں'' تک کہا جاتا ہے۔اسی طرح پادری ''باپ'' ہیں، جب کہ راہب ''بھائی'' کہلاتے ہیں۔پوپ ''مقدس باپ'' ہے، اور خود مذہب کو ''مقدس مادر چرچ'' کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹامسن نے خودکش حملہ آوروں کا خصوصی مطالعہ کیا ہے، اور وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی بھرتی اور تربیت میں رشتے داری پر مبنی نفسیات کس طرح استعمال کی جاتی ہے:

شعلہ بیان بھرتی کار اور تربیت کار مصنوعی رشتوں کے دھڑے تخلیق کرتے ہیں۔ ان میں خود ساختہ بھائی شامل ہوتے ہیں جو اپنے برادر مسلمانوں اور بہنوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر برہم اور اپنے اصل خاندانوں سے دور ہوتے ہیں۔ ایسی شہادت کی کشش صرف متعدد حوروں کے جنسی تخیّل تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس سے منتخب رشتے داروں کا جنت کا ٹکٹ کٹانے کا موقع بھی ملتا ہے۔

ٹامسن نے ایک ایک کر کے مذہب کے دوسرے عناصر، مثلاً مشترکہ عبادت، علما کی تعظیم، مذہبی رسوم، وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ جو نکتہ بھی اٹھاتے ہیں اس میں سچائی کا پرتو نظر آتا ہے۔ ان کا اسلوب بھی نکھرا ہوا اور منظر کشی واضح ہے۔ اینڈی ٹامسن غیر معمولی طور پر دل نشیں ادیب ہیں، جس کی روشنی کتاب کے صفحات پر جگہ جگہ بکھری نظر آتی ہے۔ یہ مختصر، مگر مؤثر کتاب تیزی سے پڑھی جائے گی اور تادیر یاد رکھی جائے گی۔

تمہید

یہ کتاب نائن الیون کی بازگشت کے طور پر وجود میں آئی۔ میرا بیٹا میتھیو ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے قریب ایک عمارت میں نوکری کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اس نے اس جہنّم کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے موت کے دہانے کے قریب پہنچ جانے کے ردِعمل کے طور پر میں نے خودکش دہشت گردی کا مطالعہ شروع کر دیا۔

انسان کے ہاتھوں پھیلائی ہوئی تباہ کاریاں میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ فورینزک سائیکاٹرسٹ کے طور پر مجھے پرتشدد لوگوں کے ساتھ گہرا رابطہ رکھنا پڑتا ہے۔ میں کئی سال یونیورسٹی آف ورجینیا کے مرکز برائے مطالعۂ دماغ وانسانی تعامل سے وابستہ رہا ہوں۔ یہ ماہرینِ صحت، سفارت کاروں، اور تاریخ دانوں کا ایک منفرد بین الشعبہ جاتی گروپ ہے، جسے سائیکاٹرسٹ وامک وولکن نے قائم کیا تھا۔ وولکن نے دنیا بھر کے حساس علاقوں کا دورہ کر کے تصادموں کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ انھیں حل کروانے میں بھی کردار ادا کیا تھا۔

لیکن میرے پیشہ ورانہ فرائض اور صدمے سے دوچار معاشروں کے تجربے کے

باوجود میں نے خودکش دہشت گردی کے مطالعے کے دوران نظریات وخیالات کی ایک نئی اور پھلتی پھولتی دنیا دریافت کی۔ اس کے علاوہ میں نے انسانی دماغ کی کارکردگی، جس کا خاص تعلّق مذہب سے تھا، کے بارے میں بھی کچھ شواہد اکٹھّے کیے۔ اس دوران میں نے درسی کتابوں اور رسائل سے استفادہ کیا، جن میں سے کچھ زیادہ کم اور کچھ زیادہ دقیق تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ ایسی کوئی واحد کتاب نہیں پائی جاتی جس میں ان نئے اور سنسنی خیز خیالات کو ایسے آسان طریقے سے بیان کیا گیا ہو جس سے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والا ایک عام قاری فیض یاب ہوسکتا ہو۔

زیرِ نظر کتاب میں میں نے یہ کام کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ ان خیالات کو ایک مشتاق قاری تک پہنچا سکوں۔

مجھے کبھی بھی مذہب کی تک سمجھ میں نہیں آئی، لیکن تابع فرمان اولاد کی طرح میں بھی اپنے بڑوں کی معین کردہ ڈگر پر چلتا رہا۔ کہ وہ لوگ جنہیں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور جو دنیا اور زندگی کو جانتے اور سمجھتے ہیں، اگر انھیں مذہب ٹھیک لگتا ہے تو پھر مجھے بھی چاہیے کہ میں اس جلوس میں شامل ہو جاؤں۔ اگرچہ میں کہتا رہتا تھا کہ میں مذہب پر یقین رکھتا ہوں، لیکن میرے الفاظ میں کوئی جذباتی لگاؤ شامل نہیں ہوتا تھا۔ بدھ کی شام اور اتوار کی صبح منا جاتیں گانا دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا خوش گوار موقع فراہم کرتا تھا۔ اگرچہ جو منا جاتیں ہم گایا کرتے تھے وہ ماتمی دھنوں کی طرح ہوتی تھیں لیکن اچھی مذہبی موسیقی شاندار ہوا کرتی تھی۔ ہینڈل کی دھن ''مسیحا'' آج تک مجھ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

بطورِ سائیکائٹرسٹ تحلیلِ نفسی کی تربیت کے دوران میں نے سگمنڈ فرائڈ کی کتاب ''وہم کا مستقبل'' (Future of Illusion) پڑھی۔ فرائڈ نے واضح طور پر ہمارے علم میں اضافہ کیا ہے کہ انسانی دماغ مذہبی خیالات کیوں پیدا کرتا ہے۔ تاہم اس کی پیش کردہ تشریح مکمّل نہیں ہے۔

ارتقائی نفسیات کے نئے قائم شدہ شعبے سے وابستگی کے باعث خودکش دہشت گردی پر تحقیق کے دوران میں نے سکاٹ ایٹران، جیسی بیرنگ، پاسکل بوئر، سٹوارٹ گتھری، رچرڈ سوسس، اور لی کرک پیٹرک جیسے دانشوروں کے کام سے استفادہ کیا۔ انھوں نے مذہب کا معما حل کرلیا تھا، یا اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کے کام نے خودکش حملہ آوروں پر میری تحقیق کے لیے سہ ابعادی رہنمائی کی۔

مشاہدات کے مطابق خودکش دہشت گردی کا بنیادی کلیہ کچھ یوں ہے: مردانہ رشتے میں منسلک ایک مشترکہ تشدد، جس میں بے گناہ لوگوں پر قاتلانہ حملہ کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی خود نوعِ انسانی، بلکہ اس سے بھی پرانا۔ یہ صلاحیت تمام مردوں میں موجود ہوتی ہے۔

خودکشی کا رجحان مردوں اور عورتوں دونوں میں پایا جاتا ہے۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کے دو ارتقا شدہ امکانات ہوتے ہیں: منفی مشمولہ موزونیت (negative inclusive fitness)، اور جوابی لین دین (retaliation bargaining)۔ پہلا امکان بوجھ کے احساس سے جنم لیتا ہے جو خواتین خودکش حملہ آوروں، مثلاً بیوہ اور معاشرے کی دھتکاری ہوئی خواتین، کو تحریک دیتا ہے۔ دوسرا امکان مرد خودکش حملہ آوروں پر لاگو ہوتا ہے اور یہ بے بسی اور ذلت کے احساس سے پروان چڑھتا ہے۔ چوں کہ مذہب ایک سماجی تخلیق اور انسانی ذہن کی پیداوار ہے، اس لیے ایسی کئی ارتقا شدہ ادراکی مطابقتیں (evolved cognitive adaptations) ہیں جو مذہبی عقائد کو جنم دیتی ہے اور جنہیں خودکش دہشت گردی کے محرک کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سے مذہب ایک انتہائی طاقتور نظریہ بن جاتا ہے جو ارتقا شدہ صلاحیتوں کو مہلک حملے اور خودکشی کے لیے بیک وقت ہائی جیک کرسکتا ہے۔ یہاں ساری کڑیاں آپس میں مل جاتی ہیں۔

کلیر اوکوفر کی مدد سے اس تجزیے کی اشاعت اور میری خودکش دہشت کے اصولوں کے بارے میں پریزنٹیشنز نے میری توجہ مذہب پر مرکوز رکھی۔ ناقدین اور حاضرین کے

تبصروں میں میرے خیالات کو وسعت دی۔

2009ء کے اوائل تک میں نے اپنی تحقیق مجتمع کر لی تھی اور ایک گھنٹے کی پریزنٹیشن تیار کر لی تھی جس میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ ہم خدا (یا خداؤں) پر کیوں یقین رکھتے ہیں۔ رچرڈ ڈاکنز اور ان کی فاؤنڈیشن برائے دلیل و سائنس کی مدد سے اس پریزنٹیشن کو بہت مہارت سے فلمایا گیا، اور اسے یوٹیوب پر پوسٹ کیا گیا، جہاں ایک قلیل مدت میں اسے لاکھوں بار دیکھا گیا۔ میرے کام میں اس درجہ دلچسپی کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ مذہب کی نئی سائنس کے بارے میں ایک مختصر، واضح، اور جامع رہنما کتاب کی ضرورت ہے۔ یہی خیال اس کتاب کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب بنا۔

کلیر اوکوفر نے میری تحریر پر اپنا جادو چلایا، اور کئی نظریات کے لیے گراں قدر توضیحات اور مثالیں فراہم کیں۔

ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ عمدہ تجویز بھی پیش کی کہ ناسا کی جاری کردہ ہیلکس نیبولا کی تصویر بھی استعمال کی جائے، جسے ''خدا کی آنکھ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تصویر جزوی طور پر ہبل دوربین کی مدد سے کھینچی گئی تھی۔ تمام مصنّفوں کو ایسے ساتھیوں کی خدمات نصیب ہونی چاہئیں۔

میرا مقصد قاری کو جلد سے جلد تمام معلومات سے لیس کر دینا ہے۔ اگر آپ اس ننھّی سی کتاب کو پڑھنے میں تھوڑا وقت صرف کریں گے تو آپ یہ سمجھ پائیں گے کہ ذہن اور دماغ کیسے مذہبی عقائد کو جنم دیتے ہیں۔ (اگر آپ اس بارے میں کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں تو مجھے ان کا جواب دینے میں خوشی ہوگی۔)

پوری کتاب پڑھیں۔ اس کا حوالہ دیں۔ پڑھنے کے لیے کسی دوست کو دیں۔ کسی لائبریری یا سکول کو عطیہ کر دیں۔ اب ہم یہ جان گئے ہیں کہ ہمارے ذہن خدا پر اعتقاد کس طرح تخلیق کرتے ہیں اور اسے کس طرح پھیلاتے ہیں۔ نئی تحقیق مسلسل ہمارے علم میں اضافہ کر رہی ہے۔ یہ علم ہمیں بندشوں سے آزاد کر سکتا ہے۔ بنی نوع انسان سے بنیاد پرستانہ

مذہب کی گرفت کم کرنے کے لیے ہم جتنا بھی حصہ ڈال سکتے ہیں، چاہے وہ کتنا چھوٹا کیوں نہ ہو، وہ صحیح معنی میں ایک عالمگیر معاشرے کے قیام کے لیے ایک قدم ہوگا۔ اور شاید اسی میں ہماری نوع کی بقا بھی ہے۔ اگر آپ مذہبی خیالات کے حامل ہیں اور آپ نے یہ کتاب اپنے ہاتھوں میں اٹھائی ہے تو اس کے پیچھے بھی کوئی مقصد ہوگا۔ سو اسے پڑھیے۔

حرفِ سپاس

اس کتاب کا دیباچہ لکھنے، اور اپنے کام کے لیے رچرڈ ڈاکنز خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس لیے بھی کہ انھوں نے مجھے رچرڈ ڈاکنز فاؤنڈیشن برائے دلیل و سائنس کا ٹرسٹی بننے کا موقع دیا۔ انھیں جاننا اور ان کے ساتھ کام کرنا میرے لیے بے حد فخر کا باعث ہے۔ اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کا ایک حصہ فاؤنڈیشن کے لیے وقف کیا جائے گا۔ اگر آپ نے یہ کتاب خریدی ہے تو آپ نے فاؤنڈیشن کے لیے عطیہ دیا ہے۔ شکریہ۔

ہمیشہ کی طرح میں رچرڈ ڈاکنز کی فاؤنڈیشن برائے دلیل و سائنس کی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر روبن الزبیتھ کورن ویل کا شکرگزار ہوں۔ وہ اس کتاب کے لکھنے کے دوران عمدہ دوست اور شریکِ کار ثابت ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کے ابتدائی مسوّدوں کو نظرِ غائر سے دیکھا اور مجھے غیر معمولی موقع فراہم کیا کہ میں اپنے خیالات و نظریات کو لوگوں تک پہنچا سکوں۔

فاؤنڈیشن میں میرے ساتھی ٹرسٹی گریگ لینگر اور ٹاڈ سٹائفل نے ابتدائی مسودوں کا جائزہ لیا اور اس کوشش کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔

تشکّر

ہمارے پبلشر کرٹ وولکن اس جوش وخروش کے لیے تعریف کے مستحق ہیں جو انھوں نے اشتراک کے ابتدائی لمحوں سے لے کر آخر تک دکھایا۔ اس تمام عمل کے دوران ان کی دانش مندانہ تدوین اور رہنمائی بھی ہمارے شاملِ حال رہی۔

ولس سپالڈنگ نے رابرٹ رائٹ کی کتاب ''دا مورل اینمل'' کے تحفے کے ذریعے مجھ پر ارتقائی نفسیات کے دروازے کھولے۔ ان کے صاحب زادے ٹرسٹن نے کتاب کے اولین مسوّدے پر نہایت قابلِ قدر تنقید فراہم کی۔

سکاٹ ایٹران، جسٹن بیریٹ، جیسی بیرنگ، پال بلوم، پاسکل بوئر، سٹیورٹ گتھری، لی کرک پیٹرک، اور رچرڈ سوسس کا نام ان سائنس دانوں میں لیا جاتا ہے جنھوں نے مذہب کے ادراکی ڈھانچے پر روشنی ڈالی ہے۔

پال اینڈریوز، مارٹن بریون، ڈیوڈ بس، جو کیرل، لیڈا کاسمیڈیز، مارٹن ڈیلی، روبن ڈنبر، جوش ڈنٹلی، این آئیسن، اے جے فلوریڈو، ہیلن فشر، رس گارڈنر، ایڈورڈ ہیگن، سارا ہارڈی، اوون جونز، راب کرزبین، جیفری ملر، رینڈی نیس، کریگ پامر، سٹیون پنکر،

جان رچر، نینسی سیگل، ٹاڈ شیکل فورڈ، ولف شائفن ہاول، فرینک سلووے، رینڈی تھورن ہل، جان ٹوبی، پال واٹسن، کیرل اور گلن وائز فیلڈ، ایڈ ریاس ولکی، اور دوسرے تمام لوگ جو ارتقائی نفسیات اور انسانی علم الاخلاقیات کے میدانوں میں سرگرم رہے ہیں، انھوں نے اپنی تحریروں اور انسانی رویے اور ارتقا سوسائٹی اور ارتقا سوسائٹی کے سالانہ اجلاسوں، اور بین الاقوامی سوسائٹی برائے انسانی علم الاخلاقیات کے شش ماہی اجلاسوں میں میرے ساتھ گفتگو کے ذریعے میرے خیالات میں وسعت پیدا کی ہے۔ میں لنڈا میلی، جان پیرس، اور مارگو ولسن کی کمی محسوس کرتا ہوں، جنہوں نے مجھ جیسے مبتدی کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور جواب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔

اگر چہ ان کے اور اس کتاب میں پیش کردہ کچھ خیالات میں اختلاف ہے، میں پھر بھی یونیورسٹی آف ورجینیا میں اپنے شریکِ کار جوناتھن ہیڈٹ کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے اخلاقیات کے میدان میں میری رہنمائی کی۔

میرے بہت سے سائیکا ٹرسٹ دوستوں اور شرکائے کار نے مضامین کے ذریعے یا مجھ سے بحث کے ذریعے مذہب کے بارے میں میرے خیالات کو چیلنج کیا۔ ان میں خاص طور پر سلمان اختر، ایرا برینر، اور بروس گریسن شامل ہیں۔ سلمان اور مارگریٹ مالر فاؤنڈیشن نے مجھے فلاڈیلفیا میں ہونے والے مالر سمپوزیم میں شرکت کی دعوت دی۔ اس کانفرنس کے ذریعے پہلی بار مذہب بطور ذیلی پیداوار کے نظریے کو اشاعت کا موقع ملا۔ میرے استاد وامک وولکن نے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں یونیورسٹی آف ورجینیا کے اس منفرد مرکز میں کام کر سکوں۔ یہ کام مجھے دنیا بھر کے تنازع زدہ علاقوں تک لے جانے کا باعث بنا۔ انھوں نے دہشت گردی پر لکھی جانے والی ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں خودکش دہشت گردی کے بارے میں میرا ایک مضمون بھی شامل تھا۔

شارلٹس ول ورجینیا کے رسالے ''دا ہک'' کے مدیر ہاس سپینسر نے خودکش دہشت گردی پر میرا مضمون چھاپ کر اسے عوام تک پہنچانے کا موقع فراہم کیا۔ کلیر اوکوفر اور

روزالنڈ وارفیلڈ براؤن کے ساتھ مل کر لکھے جانے والا یہ مضمون مذہب کے بارے میں خیالات کی وجہ سے خاصا متنازع بن گیا۔ یہی خیالات اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔

جم سائمنڈز نے مجھے اہم کتابیں اور مضامین بہم پہنچائے۔ مائکلز ٹاؤنز اینڈ نے ہر چیز پر سوال اُٹھائے۔ رس فیڈرمین، جن کے ساتھ میں نے مل کر نوجوانوں میں بائی پولر بیماری پر ایک کتاب لکھی تھی، نے مجھے یہ کتاب لکھنے کے لیے حوصلہ فراہم کیا۔ میری بے بدل فورینزک سیکریٹری جون کلیولینڈ نے اس کتاب کا پہلا مسودہ ٹائپ کیا۔

میڈیکل کالج میں میرے ہم جماعت ولیم ''بل'' اوبر اس وقت سے بیالوجی کی کتاب کا درجہ رکھتے ہیں اور کمال کی ڈرائنگز بناتے ہیں جب سے میں انھیں جانتا ہوں۔

ان کی ڈرائنگز کی مدد سے قاری کو یہ جاننے میں آسانی ہوگی کہ مذہب ہمارے ذہنوں میں کس طرح پروان چڑھتا ہے۔

واشنگٹن ڈی سی میں واقع سمتھ سونیئین میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے پروگرام برائے انسانی ابتدا کے ڈائریکٹر رچرڈ پاٹس اس کتاب میں دیے جانے والے انسانی ارتقا کے خلاصے کا جائزہ لیا۔ اگر آپ نے اس میوزیم کا انسانی ابتدا والا ہال نہیں دیکھا تو پہلی فرصت میں اسے دیکھنے کی کوشش کریں۔

مائیکل پرسنگر نے کمال مہربانی سے اپنی معرکہ آرا کتاب ''گاڈ ہیلمٹ'' کے خلاصے پر نظرِ ثانی کی۔

امینڈا میکسکس اور آگسٹس برنز مین نے حتمی مسوّدے پر کارآمد تنقید فراہم کی۔ امیریکن ایتھیئسٹس، ایتھیئسٹ الائنس انٹرنیشنل، ورجینیا ایتھیئسٹس اینڈ ایگناسٹکس، نیویارک سٹی ایتھیئسٹس، ایتھیئسٹ یونائیٹڈ آف لاس اینجلس، ورجینیا کے ویسٹرن سٹیٹ ہاسپیٹل، اور جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے سیکیولر سٹوڈنٹس الائنس، جارج میسن یونیورسٹی، اور کارنیگی میلن یونیورسٹی نے اس کتاب کے موضوع پر میری تقاریر سنیں۔ میں سوالات اور مشوروں کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

آیان ہرسی علی اور فور ہورسمین، رچرڈ ڈاکنز، ڈینیئل ڈینیٹ، سیم ہیرس، اور کرسٹوفر ہچنز، اپنی تحریروں، مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ مباحثوں، اور جرات مندی کے باعث میرے دل میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔

یہ کتاب سائنس کی محبّت، اور ان سائنس دانوں کے لیے خراجِ عقیدت ہے جو ذہن کے مذہب ساز مکانزم پر کام کر رہے ہیں۔ اگر میں ان کے خیالات آپ تک پہنچانے میں کامیاب رہا ہوں تو ان کا شکریہ ادا کریں۔ تاہم جو غلطیاں ہیں، میں ان کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔

الف: انسانی دماغ، جانبی منظر

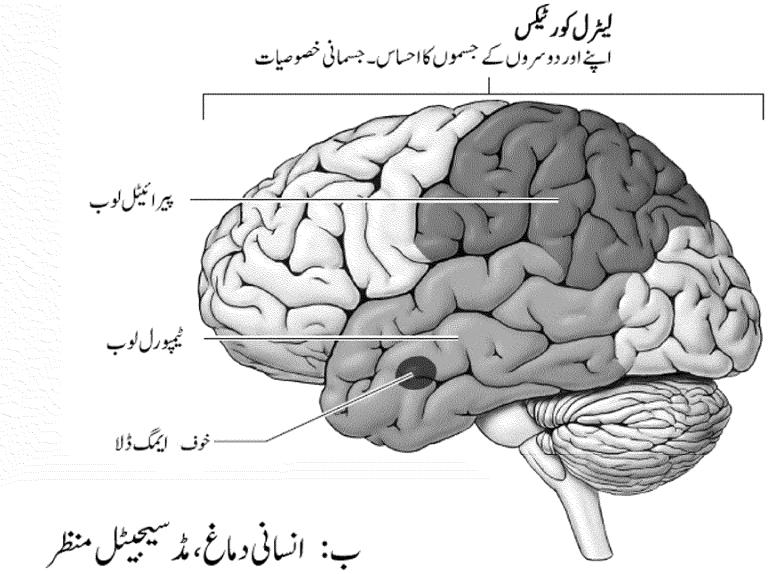

ب: انسانی دماغ، مڈ سیجیٹل منظر

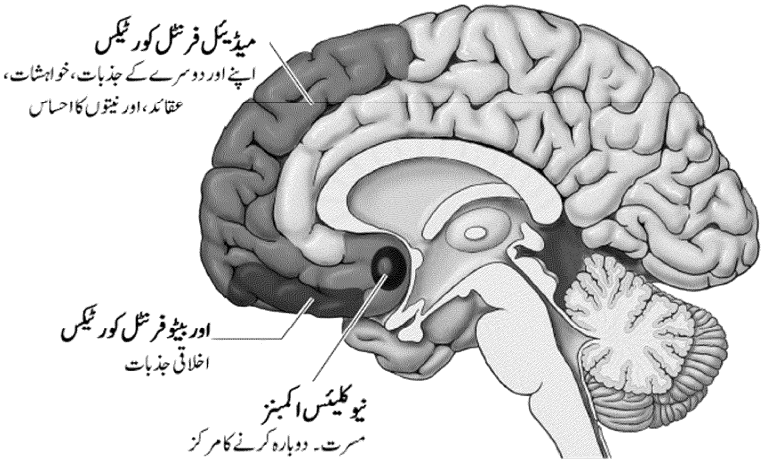

نہ تھا کچھ تو خدا تھا

اعتقاد کی طرف ہمارا میلان

''سب سے طاقت ور نوع قائم نہیں رہتی، نہ ہی سب سے ذہین نوع۔۔۔ بلکہ وہ نوع جو تبدیلی کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ڈھلنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔'' (چارلز ڈارون)

یہاں ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ارتقا مذہب سے متصادم ہے، یا ارتقا کے قدرتی کرشمات کسی قسم کی ذہین اور ہمہ دان ہستی نے شروع کیے تھے۔ تاہم اگر کسی قادرِ مطلق خدا کا واقعی وجود ہے تو اس نے اپنی تخلیق اور انسان کے ارتقا میں ایک بے حد طاقت ور چیز رکھ دی ہے: خدا پر ایمان لانے کا میلان۔

قدیم مصریوں سے لے کر ایزٹیک تہذیب تک اور ایزٹیک سے لے کر رومن تہذیب تک، کثیر پرستوں، عیسائیوں، یہودیوں، مسلمانوں، ہندوؤں، بدھ، بت پرست، شیطان پرست، ہر معلوم تہذیب کم از کم ایک خدا یا کسی مرکزی روحانی ہستی کے تصور کے گرد گھومتی رہی ہے جس کا ممکنہ تعلّق کسی مافوق الفطرت دنیا سے ہوتا ہے۔

کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ مذہب بظاہر انسانوں اور ان کی تخلیق کردہ تہذیبوں کا آفاقی جزو ہے؟

اب ہم یہ بات سمجھنے لگے ہیں۔ گزشتہ دو عشروں کے دوران نفسیات اور ادراکی (cognitive) نیوروسائنس میں انقلاب برپا ہوا ہے۔ اس انقلاب سے اس سوال کا ارتقائی جواب ملا ہے کہ انسانی دماغ مذہبی عقائد کیونکر پیدا کرتا ہے، ہم کیوں مخصوص قسم کے عقائد کو جنم دیتے ہیں، اور ہمارے دماغ کیوں انھیں قبول کرنے اور پھیلانے کا رجحان رکھتے ہیں۔

اب ہمارے پاس ٹھوس نظریات اور عملی شواہد موجود ہیں، بشمول دماغ کے اندر کی تصویروں کے، جن سے ان جوابات کو تقویت ملتی ہے۔ معمّے کے اجزا اپنی جگہ پر بیٹھ رہے ہیں۔ ہم اب اس سوال کے جواب کے لیے سائنس سے رجوع کر سکتے ہیں کہ کیوں انسانی دماغ مذہبی تصورات پیدا اور قبول کرتا ہے اور کیا وجہ ہے کہ ان نظریات کی خاطر انسان اپنا رویہ تبدیل کرتا ہے، اور مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔

چارلز ڈارون کا قدرتی چناؤ کا نظریہ انسانی ذہن کے تخلیق کردہ اہم ترین تصورات میں سے ایک ہے، اور شواہد اسے درست ثابت کر رہے ہیں۔ قدرتی چناؤ زمین پر موجود زندگی کے تمام تر تنوع اور رنگارنگی کے لیے واحد قابلِ عمل سائنسی تفہیم ہے۔ اور یہ انسانی دماغ کی کارکردگی اور ساخت کی بھی قابلِ عمل تفہیم ہے۔ دماغ، جو خداؤں اور دیوتاؤں کا مولد ہے۔

اپنے اردگرد نظر دوڑائیں۔ ہم سب ایک نوع سے تعلّق رکھتے ہیں، ہوموسیپی انز۔ اگرچہ ہماری شکلیں اور قد کاٹھ مختلف ہیں، صلاحیتیں مختلف ہیں، لیکن اس تمام رنگارنگی کے باوجود کئی خصلتیں موروثی ہیں۔ ہماری شکلیں ہمارے والدین اور رشتے داروں سے ملتی ہیں۔ ہماری خامیاں اور خوبیاں اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ مشترک ہیں۔ ہم سب کامیابی کے زائدہ ہیں۔

''موزوں ترین کی بقا'' کی اصطلاح کو اکثر لوگ صحیح طریقے سے نہیں سمجھتے۔ ڈارون کے مطابق موزونیت کا مطلب حالات کے مطابق ڈھلنا، ماحول کا مقابلہ کرنا، اور نسل آگے بڑھانے کی صلاحیت ہے۔ بقا کی جدوجہد ان جانداروں کو چھانٹ دیتی ہے جن میں ان صلاحیتوں کا فقدان ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ڈارون کو صحیح صحیح معلوم نہیں تھا کہ موروثیت ایک نسل سے دوسری نسل تک کیسے منتقل ہوتی ہے۔ اس بات کے علم کے لیے ہمیں 1953ء تک کا انتظار کرنا پڑا جب جیمز واٹسن اور فرانسس کرک نے ڈی این اے کی ساخت دریافت کی۔ اس طرح پہلی بار معلوم ہوا کہ موروثیت کی ترسیل کس طرح ہوتی ہے۔

ڈارون میں واٹسن اور کرک کے امتزاج، اور قدرتی چناؤ میں جینیٹکس کی آمیزش سے جدید ڈارونینن تالیف وجود میں آتی ہے۔ ہم ارتقائی وقت کے دوران بقا کی خاطر اپنے آپ کو اپنے مخصوص ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ڈارون نے جزائرِ گیلاپیگس کے جانداروں کو اپنے اپنے ماحولوں میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ گیلاپیگس کے علاوہ دنیا میں اور کہیں درختی چھپکلی (iguana) سمندر میں نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے کے جانداروں تک کو تھوڑے سے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اور انھوں نے اسے اپنے اپنے طریقوں سے حل کیا۔ یہاں ہر جزیرے کا اپنا الگ ماحولیاتی نظام (ecosystem) تھا جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ لیکن اہم تر بات یہ ہے کہ انھوں نے ان نئی خصوصیات کو اگلی نسلوں تک منتقل کیا تھا۔

ہر جاندار، بشمول انسان، دراصل انہی مطابقتوں (adaptations) کا ایک مربوط مجموعہ، یا ماحول کی طرف سے پیش کردہ مسائل کا حل ہے، جسے قدرتی چناؤ طویل ارتقائی زمانے کے دوران وضع کرتا ہے۔ ہر مطابقت کسی مخصوص طریقے سے ان جینز کی بقا میں مدد دیتی ہے جو ان مطابقتوں کی ساخت میں کام آتے ہیں۔

ایٹموں سے لے کر دماغ تک، ہم ہر درجے پر ڈارون کے قدرتی چناؤ کو سرگرمِ کار

دیکھتے ہیں۔ اپنے آپ پر نظر دوڑائیے۔ آپ کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔ بطور جاندار آپ کو ضرورت تھی کہ آپ ارتقا کے ذریعے ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جس کی مدد سے آپ فضا سے آکسیجن حاصل کر کے اسے اپنے جسم تک پہنچا سکیں۔

آپ کے دل کی ساخت خون کو پمپ کرنے کے مسئلے کا حل پیش کرتی ہے۔ آکسیجن کو دماغ اور دوسرے اعضا تک پہنچانے کا مسئلہ ہیموگلوبن پروٹین حل کرتی ہے۔ دل ہیموگلوبن میں موجود جس آکسیجن کو پمپ کرتا ہے وہ پھیپھڑوں سے آتی ہے جو فضا سے آکسیجن کھینچنے کا مسئلہ حل کرتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ ہم اس تمام کارروائی کو ''عملِ تنفّس'' کہتے ہیں۔

انسان کے دماغ اور ذہن پر بھی اسی جدید تالیف کا اطلاق ہوتا ہے۔ دماغ بھی ایک عضو ہے۔ ہارورڈ کے ماہرِ نفسیات اور تحقیق کار سٹیون پنکر کے الفاظ میں ذہن وہ ہے جو دماغ کرتا ہے (mind is what brain does) کسی بھی دوسرے زندہ عضو کی طرح دماغ بھی مختلف مربوط آلات کا دلکش امتزاج ہے جسے قدرتی چناؤ نے طویل ارتقائی زمانوں کے دورانیے میں بقا کے مخصوص مسائل حل کرنے کے لیے تخلیق کیا ہے۔ ان مطابقتوں، بشمول سماجی مطابقتیں جو ہمیں چھوٹے گروہوں میں زندگی گزارنے میں مدد دیتی ہیں، کا ارتقا ذہن کے اندر اس طریقے سے ہوا ہے کہ وہ ان جینز کی ترسیل میں مدد دے سکیں جو ان کی ساخت کے ذمے دار ہیں۔

جب آپ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو آنکھ کے پردے (ریٹنا) پر بننے والی تصویر اُلٹی اور دو ابعادی ہوتی ہے۔ آپ کا دماغ متعدد بصری مطابقتوں کے ذریعے اس تصویر کو سیدھا کرتا ہے اور اسے سہ ابعادی بناتا ہے۔ ان میں رنگوں، حرکت، خدوخال، اور شکل کے کناروں کو شناخت کرنے والے اجزا شامل ہیں جو خاموشی سے یہ سارا عمل سرانجام دیتے ہیں۔

ہمارے آباواجداد نے اسی طرح کے پیچیدہ سماجی مطابقتیں اختیار کی تھیں۔ جب

آپ کوئی چہرہ دیکھتے ہیں تو آپ اس شخص کی جنس، عمر، خوبصورتی، حیثیت، جذباتی حالت، شخصیت، اور اس شخص کے غیر مرئی دماغ، بشمول اس کی نیت، عقائد اور خواہشات، کے بارے میں تجریدی اندازے لگاتے ہیں۔ اکثر اوقات ہمیں ان ''اندازہ ساز'' مطابقتوں کا پتا نہیں چلتا، اور ان میں سے کئی تو ہمیشہ کے لیے لاشعور میں چھپی رہتی ہیں۔ وہ فیصلے جو آپ پلک جھپکتے کرتے ہیں، ان کی تشکیل میں لاکھوں سال صرف ہوئے ہیں۔

ذہن/دماغ ناقابلِ یقین حد تک گنجلک ہے۔ اپالو خلائی جہاز کا تصور کریں، جو آلات کا مجموعہ تھا جن میں سے ہر آلہ مخصوص معلومات کے تجزیے کے لیے مختص تھا اور کوئی ایک مخصوص مسئلہ حل کرتا تھا۔ اس دوران خلاباز صرف چند آلات کی کارکردگی سے باخبر تھے۔ ہمارے دماغ بھی اسی طرح کام کرتے ہیں۔ ذرا ان چیزوں پر غور کریں جن کی آپ کو آگہی ہے۔ یہ کل نظام کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ ان کی حیثیت آپ کے دماغ میں ہونے والے سارے کاموں کے مقابلے پر آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ مذہب، جو کہ بذاتِ خود مطابقت نہیں ہے، لیکن وہ انہی مطابقتوں سے تقویت پاتا ہے جو ہم اپنے اردگرد لوگوں کے میلے سے تعامل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جوں جوں انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی گئی، یہ مطابقتیں مخصوص سماجی اور ذاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے وجود میں آتی گئیں۔ تقریباً اتفاقی طور پر، لیکن یکساں پراثر طریقے سے، انھوں نے ہر مذہبی تصور، عقیدے، اور رسم کی بارآوری کے لیے کھادفراہم کی۔ مذہبی عقائد معمولی تغیّر کے ساتھ سماجی بقا کے بنیادی تصورات ہیں۔

یہ بات کہ مذہب ان مطابقتوں کی ذیلی پیداوار ہے جو دوسری وجوہات کی بنا پر وجود میں آئی تھیں، اس کی زبردست طاقت کو کم نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم باب 9 میں بیان کریں گے، لکھنا اور پڑھنا بذاتِ خود مطابقتیں نہیں ہیں، بلکہ یہ ان مطابقتوں کی ذیلی پیداوار ہیں جن کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔

تمام مذاہب۔۔۔ جنہیں کائنات کی علت، ماہیت، اور غایت کے بارے میں

عقائد کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔۔۔کسی ایک یا ایک سے زائد مقدس ہستیوں یا اساتذہ پر ایمان لانے سے شروع ہوتے ہیں۔ان میں سے اکثر میں ایک ایسا خدا یا ایک سے زائد خدا شامل ہوتے ہیں جو ہم سے تعامل کرتے ہیں، ہماری زندگیوں میں مداخلت کرتے ہیں، ہماری خاموش دعائیں سنتے ہیں، اور انھیں قبول کرتے ہیں، اور ہر چیز پر قادر ہوتے ہیں۔اپنے مقصد کی خاطر ہم صرف ایک خدا پر بات کریں گے، اور اسے مرد تسلیم کریں گے۔اس سے قطعِ نظر کہ بہت سے مذہب ایسے ہیں جن میں متعدد خدا ہوتے ہیں جن کے پاس مختلف قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں، جب کہ کچھ مذاہب میں دیویاں بھی پائی جاتی ہیں۔تاہم یہ سب غیر معمولی طور پر یکساں ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تینوں بڑے ابراہیمی مذاہب کا خدا ایک ہی ہے، اس لیے ہم اپنی مثالوں کے لیے اسے استعمال کریں گے۔

یہ ایک پدری خدا ہے، اور کسی بھی اچھے باپ کی مانند ہم سے غیر مشروط محبّت کرتا ہے۔تاہم عموماً وہ ہماری دُعائیں اسی وقت سنتا ہے جب ہم اس کی مطلوبہ شدت سے عبادت کریں، اس کی راہ میں قربانیاں دیں، یہ تسلیم کریں کہ ہم خطا کے پتلے ہیں اور اس کا بے تحاشا شکر بجالائیں (چاہے وہ ہماری دعائیں قبول کرے یا نہ کرے)، اور اس بات پر یقین رکھیں کہ ہم سب برے پیدا ہوئے ہیں۔یہ خدا نہ صرف ہماری دعاؤں پر فیصلے صادر کرتا ہے، بلکہ ہمارے بارے میں دوسرے انسانوں کی دعاؤں کو بھی مدِنظر رکھتا ہے جو ہمارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔اگر وہ ہماری خواہشات یا ضروریات کو مسترد بھی کردے، تب بھی ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے لیے یہی بہتر تھا، چاہے بظاہر ہمیں ایسا دکھائی نہ دیتا ہو۔اس غیر مرئی خدا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہوتی ہے۔یہ سب کچھ ہمارے ذہن میں پسِ پردہ چلتا رہتا ہے چاہے ہم اس کے بارے سوچ نہ رہے ہوں۔

نوجوانی میں اگر آپ کی ماں آپ کو ایک ایسی لڑکی کا رشتہ بتائے جو غیر معمولی طور پر حسین ہے، حد سے زیادہ مالدار ہے، مہربان اور محبّت کرنے والی ہے، اور اگرچہ آپ سے کبھی نہیں ملی لیکن پھر بھی آپ کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے، تو کیا آپ اس کا یقین کر

لیں گے؟ خیر شاید کر بھی لیں، کہ آخر نوجوانی ہے۔ لیکن شاید صرف چند منٹوں کے لیے۔

تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ایک مخفی خدا پر یقین رکھتے ہیں جو یہ سب، بلکہ اس سے بھی زیادہ کرتا ہے؟ جو کچھ ہمارے ذہنوں میں ہو رہا ہوتا ہے، اس کے مقابلے پر کسی مقدس مافوق الفطرت ہستی پر ایمان رکھنا آسان لگتا ہے۔ خدا پر ایمان لانے کے لیے ہمارا ذہن بیس سے زیادہ اختیار کردہ مطابقتوں کو استعمال کرتا ہے جو قدرتی چناؤ کے ہزاروں جگوں کے عمل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ ان کا مقصد ہمیں اپنے ساتھی ہوموسیپینز انسانوں کے ساتھ مل جل کر جینا اور اس زمین پر غلبہ حاصل کرنے کے قابل بنانا ہے۔ آگے آنے والے صفحات میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ کیوں اور کیسے انسانی اذہان نہ صرف ناممکن کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ انھوں نے اس کی خاطر فرقے اور مسلک تشکیل کر رکھے ہیں۔

ہم آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح انسانوں نے خدا پر ایمان لانا، اس سے محبّت کرنا، اس سے ڈرنا، اس پر معاملات چھوڑ دینا، اس کی شکل وصورت کو خود پر قیاس کرنا، اس سے مانگنا اور توقع رکھنا کہ وہ دے گا، عبادات ورسوم تخلیق کرنا، اور حتیٰ کہ اس کے لیے لڑنا اور مرنا شروع کیا۔ ہم آپ کو یہ بھی بتائیں گے کہ یہ اختیار کردہ سماجی خصلتیں کس طرح مذہبی عقائد کو ترک کرنا غیر معمولی حد تک مشکل بناتی ہیں، چاہے ہم ان سے چھٹکارا ہی کیوں نہ حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

لیکن اس سے پہلے ارتقا کی بنیادی باتوں کا کچھ تذکرہ ہو جائے۔

شکل و شباہت

ارتقا کی الف بے

''کسی غلطی کی اصلاح کرنا نئی حقیقت کی دریافت کے برابر یا اس سے بہتر عمل ہے۔'' (چارلز ڈارون)

ہم نیچے گرے ہوئے فرشتے نہیں بلکہ اوپر اٹھے ہوئے بندر ہیں۔۔۔اور اب ہمارے پاس اسے ثابت کرنے کے لیے شواہد موجود ہیں۔ ہماری انا ہمیں تسلیم کرنے سے روکتی ہے، اور جو لوگ خدائی تخلیق پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ اس تصور کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ جب سے ڈارون نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے، بہت سوں کو صرف یہ خیال کہ انسان ''ادنیٰ'' جانوروں سے بنا ہے، ارتقا کے نظریے کو کلی طور ردّ کر دینے پر مائل کروا دیتا ہے۔ لیکن ایسے بے پناہ شواہد موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم دوسرے تمام جانداروں کی طرح اس قدیمی تلچھٹ سے ارتقائی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں جہاں سے زمین پر پائی جانے والی تمام حیات کا آغاز ہوا تھا۔

افریقہ کے مشرقی ساحل پر گریٹ رِفٹ ویلی پائی جاتی ہے جو ایتھوپیا سے موزنبیق

تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ وادی نسلِ انسانی کے لیے رحمِ مادر کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے صحیح معنوں میں باغِ عدن کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نوعِ انسان نے اپنا مخصوص ارتقائی سفر شروع کیا۔

ہمارا ارتقا بندروں سے نہیں ہوا۔ سائنسی نقطۂ نظر سے ہم ہی بندر ہیں۔ ہمارا اور چمپینزیوں کا 98.6 فی صد ڈی این مشترک ہے۔ ہمارا اور ان کا جدِامجد بھی مشترک ہے جو 50 تا 70 لاکھ سال پہلے گزرا ہے۔ اس مشترک جدِامجد سے انسانی نسل پھوٹی اور کئی مختلف ارتقائی راستوں پر چل نکلی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی جھاڑی کی شاخیں جڑ سے پھوٹتی ہیں۔ انجامِ کار ایک کو چھوڑ کر دوسری تمام انسان نما نسلیں معدوم ہوگئیں۔ صرف ایک بچی، ہم اور آپ جس کے زائدہ ہیں۔

ہم مخصوص افریقی بندر، یا ہومینڈ (hominid) کی نسل کا آخری نمونہ بچے ہیں۔ ارتقائی نقطۂ نظر سے ماضیِ قریب، یعنی صرف 50 ہزار سال پہلے دنیا میں چار مختلف ہومینڈ نسلیں پہلو بہ پہلو آباد تھیں۔ باقی ہومینڈ ختم ہوگئے، صرف ہمی بچ پائے۔

اب ہماری ملاقات ہمارے کئی آبا سے ہوچکی ہے۔ ہم نے Ardipithecus کے فاسلز دریافت کیے ہیں، جو ہمارے اور چمپینزیوں کے مشترکہ جدِامجد کے قریب ترین رشتے داروں میں سے ایک تھا۔ بظاہر یہ ایک ایسی نسل تھی جو جوڑوں کی شکل میں رہتی تھی اور کم جارح خصوصیات کی حامل تھی۔

Australopithecus کا مطلب افریقہ کا جنوبی بندر ہے۔ اس نسل کی وجہ شہرت مشہور فاسل ''لوسی'' ہے، جو چالیس برس قبل ایتھیوپیا سے ملا تھا۔ ایک اور فاسل Paranthropus (جس کا مطلب ''انسان کے قریب'' ہے) جو 1938ء اور 1948ء میں جنوبی افریقہ سے ملا تھا۔ اس کا دماغ ہمارے دماغ کے 40 فی صد کے برابر تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ چوں کہ یہ نسل ماحولیات اور غذا میں ہونے والی تبدیلیوں کا مقابلہ نہیں کرسکی، اس لیے صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

افریقہ ہی میں 2008ء میں ایک ماہرِ قدیم حیاتیات کے نو سالہ بیٹے نے ایک کہیں زیادہ قدیم نو سالہ لڑکے کی کھوپڑی دریافت کی۔ یہ کھوپڑی بھی ایک ہومینڈ کی ہے جس کا نام Australopithicus sediba رکھا گیا ہے۔ ممکنہ طور پر یہ ہمارے اور Australopithicus نسل کے درمیان پائے جانے والے روابط پر مزید روشنی ڈالے گی۔

ہمارے ابتدائی ہومینڈ کے علاوہ یہ انواع افریقہ میں لگ بھگ 20 لاکھ سال تک پہلو بہ پہلو رہے۔ ہمارے مقابلے میں ان انواع کا زمانہ بے حد طویل رہا ہے۔

ہمارے گروپ، یعنی ہوموکا فاسل ریکارڈ کوئی 20 لاکھ پہلے سے ملنا شروع ہوتا ہے۔ اس گروپ میں Homo habilis، Homo erectus اور Homo heidelbergensis شامل ہیں۔ Homo erectus کوئی دس لاکھ سال پہلے افریقہ سے باہر نکلا اور کوہِ قاف، چین، اور انڈونیشیا تک جا پہنچا۔ غالباً اس کے پاس زبان کی صلاحیت نہیں تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ پہنچ کر Homo heidelbergensis کے کچھ ارکان ارتقائی منازل سے گزر کر نی اینڈرتھال میں ڈھل گئے۔ حالیہ ڈی این اے سیکوئنسنگ سے پتا چلتا ہے ہمارے Homo sapiens آبا اور نی اینڈرتھال میں کچھ نہ کچھ جنسی اختلاط رہا ہے۔ وہ Homo heidelbergensis جو افریقہ ہی میں رہ گئے تھے، جسمانی طور پر جدید انسان انھی سے وجود میں آئے ہیں۔

Homo sapiens کے قدیم ترین فاسل تقریباً دو لاکھ سال پرانے ہیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے علامتی صلاحیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ جیسے رنگ جو ممکنہ طور پر رنگنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہوں، مختلف گروہوں کے درمیان طویل فاصلے سے ہونے والا لین دین، اور تجارت۔ اس کاموں کے لیے کسی قسم کے پیچیدہ علامتی ابلاغ کی ضرورت تھی۔ اس بات کا غالب امکان ہے کہ ہماری نوع کے قدیم ترین ارکان کے پاس ایک ایسی صلاحیت موجود تھی جو ان کے شعوری، سماجی، اور نفسیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کی

اہل تھی۔۔۔زبان کی صلاحیت۔

زبان کی صلاحیت سے مالا مال میری اور آپ کی طرح کے جدید ہوموسیپیئنز نے آج سے 60 ہزار سال قبل افریقہ سے ہجرت شروع کی۔

تمام نسلی، ثقافتی، قومی، اور مذہبی اختلافات کو ایک طرف رکھیئے۔ ہماری جلدوں کے اندر ہم سب افریقی ہیں۔ ہم سب ایک چھوٹے سے گروہ کی اولاد ہیں، جو بقا کی دوڑ میں دوسری ہوموانواع کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکلا اور انجامِ کار تمام دنیا کو تسخیر کر لیا۔

یہ بات اور بھی حیران کن ہے 70 ہزار سال اور ایک لاکھ سال کے بیچ ایک ایسا دور بھی آیا جس میں شدید موسمی تغیّرات کی بنا پر ہماری آبادی صرف 600 نفوس تک محدود رہ گئی تھی۔ یہ بات ہمیں جدید جینیٹکس سے معلوم ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت روئے زمین پر موجود سات ارب انسانوں میں سے ہر ایک اس چھوٹے سے جنگلی گروہ کی اولاد ہے جو اس ہولناک موسمی تغیّر سے بچ نکلا تھا۔

صرف ہمی کیوں؟ ہم کیوں اور کیسے بچ نکلے؟ Australopithecus، Homo erectus اور جدید انسانوں کی کھوپڑیوں کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں آنکھوں سے اوپر کی جگہ پر تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ جدید انسان کا ماتھا کی ڈھلوان کی بجائے گول ہونا شروع ہو گیا۔ دماغ کا حجم جو Australopithecus میں 400 تا 500 مکعب سنٹی میٹر تھا، وہ ہوموایریکٹس میں دوگنا، جب کہ ہوموسیپیئنز میں تین گنا ہو گیا۔ یہ تبدیلی فرنٹل لوب کے مقام پر زیادہ نمایاں ہے۔ دماغ کے اندر یہ وہ جگہیں ہیں جہاں پیچیدہ مشینری پائی جاتی ہے، یعنی وہ ارتقا شدہ مطابقتیں جو ہمیں ہماری سماجی دنیا سے تعامل کرنے کا اہل بناتی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے محرکات تھے جن کے باعث ہمارے دماغ کا حجم اتنا بڑھ گیا؟ وہ محرک ہم خود تھے۔ بالخصوص، ہماری نوع کے دوسرے افراد، کیوں کہ ہمیں بقا کے لیے ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے کی ضرورت تھی۔ جسمانی بقا کے

لیے سماجی بقا ضروری تھی۔ چناں چہ ہم نے ''گروہ پن'' تشکیل دیا۔

اگر آپ کسی کھیل کے ایک کمرے کے اندر موجود افراد کو من مانے طریقے سے دو گروہوں میں تقسیم کر دیں تو وہ خود بخود اپنی شناخت اس گروہ کے حوالے سے کرنے لگیں گے جو انھیں تفویض کیا گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس گروہ کے ''اندر'' اور دوسرے گروہ والوں کو ''باہر'' سمجھیں گے۔ دونوں گروہوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوگا، چاہے کھیل شروع ہونے سے قبل کسی گروہ کے اندر موجود افراد ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ لیکن اب اجنبی ایک ٹیم کے ارکان بن گئے ہیں۔ کیا آپ کو یہ عجیب سا نہیں لگتا؟ شاید نہیں، کیوں کہ یہ صحیح معنوں میں قدرتی عمل ہے۔ قوی امکان ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہ ''گروہ پن'' ہمارے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس کی مدد سے ہمارے آبا کو اپنی دنیا میں زندگی گزارنے میں مدد ملتی تھی۔

قریبی رشتے داروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے دھڑوں کے اندر زندگی گزار کر ہم انسانی معاشرت کی اس شکل میں ڈھلے ہیں جو آج پائی جاتی ہے۔ یہ کوئی بہت قدیم تاریخ بھی نہیں ہے۔ صرف پانچ سو سال قبل دنیا کی آبادی کا دو تہائی حصہ شکاریوں اور اکٹھا کرنے والوں (hunter gatherers) کے چھوٹے چھوٹے قبیلوں پر مبنی تھا۔ یہ وہ سماجی ماحول ہے جس سے جدید انسان معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ہم اپنی نفسیات میں کئی لحاظ سے آج بھی خاصے قبائلی ہیں۔ لیکن پھر یہ بھی ہے کہ ہم اب بھی کم عمر نوع ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ اس کا مذہب سے کیا تعلّق ہے؟ سب کچھ۔

مذہب روزمرہ زندگی کے سماجی ذہنی معاملات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ مطابقتی نفسیات (Adaptive Psychology) کے وہ مکینزم ہیں جنھوں نے ہمیں دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلّقات قائم کرنے، ان کی نیت اور منشا معلوم کرنے، اور تحفّظ کا احساس پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔ یہ مکینزم ماضیِ قریب میں ہمارے اوّلین وطن افریقہ میں پروان چڑھے تھے۔ انہی کی وجہ سے ہم آج یہاں موجود ہیں۔

مذاہب اگر چہ بذاتِ خود مطابقت نہیں ہے، لیکن مذہبی سوچ ان نفسیاتی مکینزموں کی ذیلی پیداوار ہے جو ہمیں دوسرے لوگوں کی سماجی دنیاؤں کا تصور کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ صلاحیتیں انسان کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ چوں کہ مذہب ان مطابقتوں کو معمولی سا تبدیل کرتا ہے، اس لیے یہ بھی اتنا ہی طاقتور ہے۔

چلیے ان مطابقتاً نہ ذیلی پیداواروں کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں: کیا آپ کو فاسٹ فوڈ پسند ہے؟ ایک بڑے سائز کا لذیذ برگر، خستہ فرنچ فرائیز اور یخ کولا؟ بہت سے لوگ اس قسم کا کھانا پسند کرتے ہیں اور بعض اوقات انھیں اس کی شدید طلب بھی ہوتی ہے۔ اگر آپ کو فاسٹ فوڈ کی طلب نہیں ہوتی تو ممکن ہے کبھی کبھار مرغن کھانے کی ہوتی ہو۔ یا آئس کریم کی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنی صحت کے خیال رکھتے ہوں اس لیے ان سے گریز کرتے ہوں، لیکن قوی امکان ہے کہ آپ کبھی کبھار مغلوب ہوکر اپنی مرضی کے بغیر اس قسم کا کھانا کھا لیتے ہوں۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر آپ فاسٹ فوڈ، مرغن کھانے یا چاکلیٹ آئس کریم کی طلب کی نفسیات سمجھتے ہوں تو پھر آپ مذہب کی نفسیات بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارا ارتقا بہت شدید اور خطرناک ماحولوں میں ہوا ہے۔ اسی دوران ہمارے اندر ایسی غذاؤں کی طلب پیدا ہوئی ہے جو ہمارے لیے جسمانی طور پر بے حد ضروری تھیں۔ کسی کو بھی کھیروں کی طلب نہیں ہوتی۔ بعض اقسام کی سبزیاں اور جڑیں قدیم زمانے میں بھی دستیاب تھیں۔ لیکن ہم سب کو چکنائی والی غذا اور مٹھائیوں کی طلب ہوتی ہے۔

ابتدا میں چکنائی والی غذا شکار کیے ہوئے جانور کی چربی ہوا کرتی تھی، جو پروٹین اور کیلوریز کا انمول ذریعہ تھی۔ ابتدا میں میٹھی چیزیں پکے ہوئے پھل ہوا کرتے تھے، جن میں صحت بخش کیلوریز اور وٹامن سی موجود تھے۔ اس زمانے میں غذا کی فراوانی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ یہ امکان ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا کہ شاید کل فاقہ کرنا پڑ جائے۔

طلب ایک مطابقت ہے۔ یہ بے حد اہم لیکن حیات بخش نایاب کھانوں کی تلاش

کا مسئلہ حل کرتی ہے۔ جب ہمارے آبا کو ان کی طلب ہوا کرتی تھی تو وہ ان کھانوں کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کے مقابلے پر ان کی بقا کا امکان زیادہ ہوا کرتا تھا جن کے اندر اس طرح کی کوئی طلب پیدا نہیں ہوتی تھی۔

اور جب وہ جہاں سے اور جیسے بھی یہ خوراکیں حاصل کر لیتے تھے تو پھر اپنی اشتہا سے بڑھ کر کھاتے تھے۔ جس دنیا میں ہمارا ارتقا ہوا ہے، اس میں انھیں کچھ پتا نہیں ہوتا تھا کہ اگلے دن کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں۔ ضرورت سے زیادہ اشتہا اور اس مطابقت نے خوراک کی فراہمی کی غیر یقینی صورتِ حال کو حل کرنے میں مدد دی۔

لیکن آج دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں میں خوراک وافر مقدار میں موجود ہے، اس لیے انسانی تہذیب نے اس طلب کی تسکین کے نئے راستے تلاش کر لیے ہیں۔ اب ہمارے پاس فاسٹ فوڈ ہے، جس میں مضرِ صحت چکنائی ہوتی ہے جو ہماری رگوں کو تنگ کرتی اور وزن بڑھاتی ہے۔ کہاں یہ خوراک اور کہاں ہمارے اجداد کا شکار کیا ہوا گوشت اور جنگلی پھل۔ رس بھرے پھلوں کی جگہ پر اب ہمارے پاس سوڈا اور ٹافیاں ہیں۔

یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ چکنائی، نمک اور چینی ہمارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں، ہمارے اندر ان غذاؤں کی طلب موجود ہے، اور جب تک ہمیں تربیت نہ دی جائے، ہم انھیں گوشت اور پھلوں پر ترجیح دیتے رہیں گے۔ کیوں؟

اس لیے کہ ان کے اندر غیر معمولی ترغیب آفریں محرک موجود ہے۔ ہمارے دماغ کیلوریز کی اس حالیہ بہتات کو اچھی چیز سمجھتے ہیں، ویسے ہی جیسے یہ ہمارے اجداد کی ضرورت تھے۔ ہمارے دماغ ہمیں اس کا صلہ بھی دیتے ہیں۔ جب ہم اپنی پسندیدہ خوراک کھاتے ہیں تو دماغ کے اندر لطف و نشاط کے مراکز مسرت سے جھوم اٹھتے ہیں۔ ہم جو محسوس کرتے ہیں وہ محض ایک معمولی تسکین نہیں ہوتی بلکہ ایک شدید انبساط کی کیفیت ہوتی ہے جو دماغ میں کیمیائی مادوں کے خارج ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک اہم کیمیائی مادہ ڈوپامین کہلاتا ہے جو دماغ کے ''دوبارہ کرو'' مراکز پر عمل کرتا ہے۔ نہ صرف یہ مادے ہمیں

لطف کی لہر فراہم کرتے ہیں بلکہ یہ ہمیں مائل کرتے ہیں کہ ہم یہ نشاط انگیز عمل دہرائیں۔

لطف کا یہ احساس بھی ایک مطابقت ہے۔ ابتدا میں یہ خوراک کی طلب پیدا کر کے اہم خوراک تلاش کرنے، اور اس کے ملنے کے بعد اطمینان کی کیفیت کے باعث اہم خوراک کی فراہمی میں مدد دیتا تھا۔

نئے زمانے کی خوراکوں کے لیے ہماری غیر منطقی طلب ان مطابقتوں کا نتیجہ ہے جنھوں نے ہماری بقا میں مدد دی ہے۔ لیکن جدید خوراکوں میں ہمارے آبا کی غذاؤں کے مقابلے پر کہیں زیادہ چکنائی اور چینی ہے، اس لیے ہماری طلب کو پورا کر کے پرانے زمانے کے گوشت اور پکے پھلوں کے مقابلے پر کہیں زیادہ شدید جذباتی تسکین فراہم کرتی ہیں۔

اس لیے یہ کہنا مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ اگر آپ فاسٹ فوڈ کی نفسیات سمجھ لیں تو آپ مذہب کی نفسیات بھی سمجھ لیں گے۔ فاسٹ فوڈ تخلیق کرتے وقت ہم نے غیر شعوری طور پر خوراک کے طلب کی قدیم مطابقتوں کو ہائی جیک کر لیا تھا۔

فاسٹ فوڈ کی طلب ارتقائی عمل نہیں ہے لیکن ہمارا دماغ سمجھتا ہے کہ یہ بھی ایک مطابقت ہے۔ فاسٹ فوڈ کی یہ طلب ذیلی پیداوار ہے۔ لیکن اب یہ طلب خطرناک بن گئی ہے کیوں کہ اگر یہ قابو سے باہر ہو جائے تو اس سے صحت کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جن کا ہمارے آبا کو کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

یہ ساری بحث ہمیں دوبارہ مذہب پر لے آتی ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے، ان مطابقتوں پر، جن سے عقائد کا نظام تشکیل پاتا ہے۔

کیا ہمیں جس کی طلب ہوتی ہے وہ ہمارے لیے اچھا ہے؟

ہماری روزانہ کی روٹی

رکھوالے کی تمنّا

''مجھے لگتا ہے کہ تمام تر اعلیٰ خصوصیات کے باوجود انسان کے جسم کے
اندر اس کی ادنیٰ ابتدا کے انمٹ آثار موجود ہیں۔'' (چارلز ڈارون)

ہمارے دماغ کے پس منظر میں بقا سے متعلّق کئی ایسی مطابقتیں ہیں جو حرکت میں آنے کے لیے اشارے کی منتظر ہیں۔ یہ ہمیں دنیا، علی الخصوص سماجی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ ہم ان پر توجہ نہیں دیتے، اور اگر توجہ دیں بھی تو سرسری سی۔ لیکن یہ ہماری بقا کے لیے اشد ضروری تھیں اور اب بھی ہیں۔ یہ مطابقتیں ہمارے مذہبی عقائد کی بنیاد ہیں۔

وابستگی کا نظام

جیسا کہ ایک نغمے میں کہا گیا ہے، ہم سب کو سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔

وابستگی کا نظام ہماری سب سے طاقتور مطابقت ہے۔ اس کے بغیر ہماری نسل کا ارتقا تو الگ رہا، بقا تک ممکن نہیں تھی۔ ہم میں سے اکثر لوگ جب تناؤ کا شکار ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی رکھوالے سے رجوع کرتے ہیں جو ہماری دیکھ بھال کر سکے۔ یہ عمل ہمارے اس

دنیا میں آتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بلکہ طبی نقطہ نگاہ سے اس سے بھی پہلے سے۔

اس عمل کو سب سے پہلے برطانوی ماہرِ نفسیات جان بولبی نے 1940 میں بیان کیا تھا۔ بعد میں اس کی مزید توضیح وتشریح کینیڈین امریکن نفسیات دان میری آینز ورتھ نے ماں اور بچے پر تجربات کے سلسلے کی مدد سے کی۔ اس سے پتا چلا کہ بچے اور والدین کے درمیان تعلّق وابستگی کے نظام کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ممالیائی ورثے کا حصہ ہے جو کروڑوں برس پرانا ہے۔

نیوروسائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ وابستگی اتنی بنیادی ضرورت ہے کہ دماغی خلیوں کا ایک نیٹ ورک اس پر مامور ہوتا ہے۔ طویل مدت تعلّق آکسی ٹوسین (oxytocin) نامی ایک رطوبت قائم کرتی ہے۔ ہم اس رطوبت کے بارے میں آئندہ چل کر زیادہ تفصیل سے پڑھیں گے۔

جب ہم کم سن اور لاچار ہوتے ہیں تو وابستگی کے باعث ہمیں اپنے تحفّظ کے بنیادی وسیلے کے ساتھ نتھی ہونے میں مدد ملتی ہے۔ جب ہم بڑے ہو جاتے ہیں تو وابستگی کا نظام رومانی محبّت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگرچہ طویل مدتی تعلّق کے بعد اس رومان کے رنگ مدھم پڑ جاتے ہیں تاہم وابستگی کا نظام اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ یہ بچے اور والدین کے درمیان تشکیل پانے والا وابستگی کا نظام ہی ہے جو بڑوں کے درمیان رشتوں کو مضبوط بناتا ہے۔

وابستگی کا نظام بڑوں کی زندگی کے دوسرے تعلّقات کو بھی متاثر کرتا ہے۔ قریبی دوستیاں اس سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مشکل حالات میں بعض لوگوں پر تکیہ کرتے ہیں اور بعض پر نہیں۔ جیسے جیسے ہمارا ارتقا ہوتا گیا اور ہم چھوٹے گروہوں میں ڈھلتے گئے، ساتھیوں اور دوسرے لوگوں سے وابستگی نے ہماری بطور فرد اور بطور نسل بقا میں مدد دی۔

ہمارے آبا کے اندر وابستگی کے نظام کی ایک ناقابلِ فراموش مثال قدیم زمانوں کے ماہرِ بشریات ایلین واکر اور پیٹ شپمین کی بدولت ملتی ہے جنھوں نے ہوموار یکٹس نسل کی ایک عورت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے فاسل افریقہ میں ملے تھے۔ ان فاسلوں سے صاف پتا

چلتا ہے کہ وہ عورت وٹامن اے بہت زیادہ مقدار میں کھانے کی وجہ سے ہلاک ہوئی تھی۔ ممکنہ طور پر اس نے کسی جانور کا جگر کھایا تھا جس میں یہ وٹامن موجود تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ وہ اس زہر خوردنی کے بعد ہفتوں یا مہینوں تک زندہ رہی جس دوران اس کے جوڑوں سے خون بہتا رہا اور وہ شدید تکلیف میں رہی۔ یہ عورت دسیوں لاکھ سال پہلے کے حالات میں کسی نگہدار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ کوئی نہ کوئی لازماً اسے کھانا اور پانی دیتا رہا ہوگا اور جنگلی جانوروں سے اس کی حفاظت کرتا رہا ہوگا۔

آج ہم وابستگی کے اس نظام کو ہر روز اپنی زندگیوں، اور دوستوں، چاہنے والوں اور بچوں کے ساتھ تعلّقات میں روبہ عمل دیکھتے ہیں۔ درحقیقت، وابستگی کے نظام کو عموماً ویسے ہی تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ نہ صرف لوگ اپنے خاندان کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے پالتو جانوروں، اپنے چاہنے والوں اور اپنے دوستوں کے ساتھ بھی۔ حتیٰ کہ چارلی براؤن کا دوست لائنس اپنے کمبل سے وابستہ ہے، ایسے ہی جیسے کوئی بچہ اپنے پسندیدہ کھلونے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس تمام عمل سے ہمیں تحفّظ کا احساس ہوتا ہے۔

اور ظاہر ہے، مذہبی لوگ اپنے خداؤں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ وابستگی کا نظام نہ صرف جسمانی معاملات میں کام کرتا ہے بلکہ مذہبی ڈھانچے کے ساتھ وابستگی کی خواہش، اور ایک دائمی ابدی، محبّت کرنے والی شخصیت کے ساتھ ربط کی تمنا کی تسکین بھی کرتا ہے۔

ایک دوسالہ بچے کا تصور کیجیے جو چاہتا ہے کہ اسے گود میں اٹھایا جائے اور لاڈ پیار کیا جائے۔ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے اور آپ سے التجا کرتا ہے۔ اب یومِ خمیس کے ایک پجاری کا تصور ذہن میں لائیے جو زبانیں بولتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتا ہے اور خدا سے اسی ''مجھے اپنی گود میں اُٹھالو'' کے انداز میں التجا کرتا ہے۔ ہم دوسرے انسانوں کے ساتھ موت، اختلافات، یا فاصلے کی وجہ سے تعلّق توڑ سکتے ہیں، لیکن خدا ہر وقت ہماری خاطر ہمارے پاس موجود رہتا ہے۔

ہم اس کا مظاہرہ عملی نفسیات میں اکثر دیکھتے ہیں۔ایک نوجوان مریضہ جسے اس کے باپ نے جسمانی، جذباتی اور زبانی بدسلوکی کا نشانہ بنایا ہو وہ اپنے عیسائی مذہب میں اس کا الٹ تلاش کرتی ہے: ایک مشفق باپ جو اس سے پیار کرے اور اس کی محبّت کو قبول کرے۔وہ اپنے خدا سے زندگی کے فیصلوں کے بارے میں رہنمائی حاصل کرے گی، اس سے یوں بات کرے گی جیسے کوئی نوجوان اپنے مہربان اور باخبر باپ سے بات کرتا ہے، اور اس کے ردِعمل کے بارے میں یوں فکرمند ہوگی جیسے کوئی اپنے باپ کے ردِعمل کے بارے میں پریشان ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر ایک رکھوالے کی آرزو کبھی ختم نہیں ہوتی۔آپ کو اور آپ کے پیاروں کو بھوک، بیماری، تباہی، موت اور زندگی کی دوسری مصیبتوں سے کون بچائے گا؟ آپ کے والدین؟ جب آپ چھوٹے تھے تو خدا کے تصور کو سمجھے بغیر آپ کے والدین خداؤں کے مانند تھے جو سب کچھ کر سکتے تھے۔اگر وہ اب بھی زندہ ہیں تو آج آپ انھیں ایک عام انسان سمجھتے ہیں، جن کے پاس آپ کے تحفّظ، زخموں کو ٹھیک کرنے اور قسمت کا دھارا بدلنے کی کوئی خصوصی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کہ اب وہ آپ پر انحصار کرتے ہوں۔

ایک ہمہ دان اور قادرِ مطلق خدا کو اگر بار بار پکارا جائے تو وہ نہ صرف ہمیں اور ہمارے چاہنے والوں کو بھی تحفّظ فراہم کرتا ہے بلکہ ہمارے ہم خیال لوگ ڈھونڈنے میں ہماری مدد بھی کرتا ہے، ہمیں موت کے خوف سے بچاتا ہے، ہماری نجات کو یقینی بناتا ہے اور ہمیں وہ اخروی زندگی بخشتا ہے جس میں ہماری تمام تکالیف کا صلہ دیا جائے گا۔

یہ مذہب کا وعدہ ہے۔ہمارے والدین ہمیشہ ہماری دیکھ بھال نہیں کر سکتے، لیکن خدا کر سکتا ہے۔شیروں کی کچھار میں پھنس کر ہر کوئی خدا کو ماننے لگتا ہے۔

مذہب ہمیں مافوق الفطرت ''والدین'' فراہم کرتا ہے۔یہ وہ زبردست شخصیات ہوتی ہیں جن کے ساتھ انسان وابستہ ہوجاتا ہے اور یہ ایسی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں جن

کا ہم روزمرہ زندگی میں کبھی مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ البتہ جب ہم مشکل میں ہوتے ہیں تو خدا سے رجوع کرتے ہیں کہ وہ ہماری دعائیں سنے، ہماری خواہشات پوری کرے، اور ہماری مشکلات چاہے کتنی سخت کیوں نہ ہوں، ان کے عوض ہمیں اجر کی یقین دہانی کروائے۔

ضرر رساں فاسٹ فوڈ کی طلب کی طرح مذہبی خیالات کی جڑ بھی مطابقتوں میں ہے، لیکن آج کے مذاہب مافوق الفطرت ترغیب اور پُرکشش اجزا فراہم کرتے ہیں، جن کی وجہ سے انسان کے اندر ''ہل من مزید'' کی تڑپ بیدار ہو جاتی ہے۔ فاسٹ فوڈ کی طلب کی طرح مذہبی خیالات بھی ایسی مطابقتوں سے ابھرتے ہیں جنھوں نے ہمارے اجداد کو بقا میں مدد دی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مطابقتیں ہمارے لیے مفید ہیں۔

آپ کیا پسند کرتے ہیں، سبزی یا مرغ روسٹ؟ گوبھی یا آئس کریم؟ آپ کو کون سی غذا سے زیادہ لطف ملتا ہے؟

وابستگی اور دھتکار

مذہب کو قبول کرنے اور اسے مسترد کرنے وابستگی کی ضرورت کام کرتی ہے۔ سادہ الفاظ میں، ہم کسی محبّت کرنے والی اور دائمی شخصیت پر یقین رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ بات ہم چارلز ڈارون کی زندگی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جب وہ 1831ء تا 1836ء اپنے مشہور بحری سفر پر گیا تو اس وقت وہ تخلیق پر یقین رکھتا تھا۔ جب وہ لوٹا تو اس نے جزائرِ گیلاپیگس سے حاصل کردہ پرندے ماہرِ طیور جان گولڈ کو دے دیے۔

ڈارون نے پہلے ہی اس امکان پر غور کر لیا تھا کہ انواع جامد نہیں ہوتیں۔ زیادہ واضح طور پر، وہ خدا کی تخلیق نہیں ہیں۔ جب گولڈ نے ڈارون کو بتایا کہ گیلاپیگس کے پرندے ''فنچ'' نامی نسل سے تعلّق رکھتے ہیں جن کا پہلے سائنسی تذکرہ نہیں ملتا تو ڈارون سمجھ گیا کہ یہ انواع ماحول تبدیل ہونے کی وجہ سے وقت کے ساتھ ساتھ بدل گئی ہیں۔

1837ء کی گرمیوں میں ڈارون نے اپنی مشہور کاپیاں کھولیں اور زندگی کا درخت بنایا (tree of life)، جس میں اس نظریے کو واضح کیا گیا تھا کہ انواع ارتقائی عمل سے

گزرتی ہیں۔ اس نے لکھا کہ ''انسان اپنے عالمِ غرور میں سمجھتا ہے کہ وہ ایک شاہکار ہے جسے کسی عظیم ہستی نے تخلیق کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ابتدا جانوروں سے ہوئی ہے۔'' ڈارون کو ابھی اس طریقِ کار کا علم نہیں تھا جس کے تحت انواع میں وقت گزرنے کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ستمبر 1838ء میں اس نے ٹی آر مالتھس کا مقالہ پڑھا'' آبادی کے اصولوں پر ایک مضمون'' جس میں اس نے نظریہ پیش کیا تھا کہ جانور اس سے کہیں زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں جتنے بچ پاتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ بقا کے لیے جدوجہد ہوتی ہے اور جن کے اندر بچ جانے کی اور نسل کو آگے بڑھانے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہی باقی رہتے ہیں۔ اس نے گتھی سلجھالی تھی۔

لیکن ڈارون تک کو مذہب رد کرنے میں وقت لگ گیا۔ اس وقت اس کی منگنی مذہبی خیالات کی حامل کزن ایما ویج وڈ سے ہو چکی تھی۔ 1838ء کے موسمِ خزاں میں کسی وقت ڈارون نے اسے اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ ایما نے اسے خط لکھا،''میری عقل مجھے سجھاتی ہے کہ ایمان دارانہ اور باضمیر شکوک گناہ نہیں ہیں، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہمارے درمیان ایک دردناک خلیج پیدا کر دیں گے۔'' جنوری 1839ء میں ان کی شادی ہوگئی۔

ڈارون نے اس وقت تک اپنے قدرتی چناؤ کے نظریے پر کام مکمّل کر لیا تھا۔ لیکن یہ بیس سال تک غیر مطبوعہ رہا، جس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ ڈارون جانتا تھا کہ اس کی اشاعت سے اس کی بیوی کو کس قدر صدمہ پہنچے گا۔ لیکن 1850ء تک دونوں کے درمیان اتوار کی صبحوں کو فرق دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ایما اور بچوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے گرجے تک جاتا تھا۔ ایما اور بچے گرجے کے اندر چلے جاتے اور ڈارون اپنی چہل قدمی جاری رکھتا۔ جب اس کی چہیتی بیٹی اینی تپِ دق سے فوت ہوگئی تو اس کے مرتے ہی ڈارون کا مذہبی عقیدہ بھی مر گیا۔

1881ء میں اپنے مرنے سے ایک سال قبل اپنی آپ بیتی پر کام کرتے ہوئے ڈارون نے ایما کا خط پڑھا جس میں اس نے 1839ء میں لکھا تھا:''میری دعا ہے کہ سائنسی

نظریات کی جستجو میں کسی چیز پر اس وقت تک یقین نہ کرنا جب تک وہ ثابت نہ ہو جائے تمہارے ذہن کو ایسی چیزوں کے بارے میں بھی متاثر نہ کر دے جو ثابت نہیں کی جا سکتیں۔''

ایما کٹر عیسائی تھی، اس لیے اسے ڈارون کے خیالات اور اس کے مذہب پر یقین نہ رکھنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ خط کے نیچے ڈارون نے لکھا ''جب میں مر جاؤں گا تو جاننا کہ میں نے اسے کئی بار چوما ہے اور آنسو بہائے ہیں۔ چ ڈ۔''

نہ صرف وابستگی کا نظام مذہب کا جزوِ لاینفک ہے، یہ شاید ایسی مطابقت بھی ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کارل گبسن اپنی کتاب Darwin: How to be a Christian and Believe in Evolution میں لکھتا ہے:

''میرے پاس خدا پر یقین کرنے کی ایک ٹھوس وجہ موجود ہے۔ میرے والدین پکے عیسائی ہیں اور اگر میں مذہب ترک کر دوں تو انھیں شدید صدمہ پہنچے گا۔ میری بیوی اور بچے خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ خدا پر یقین چھوڑ دینے سے سب کچھ تہہ و بالا ہو جائے گا اور میری زندگی پٹڑی سے ہٹ جائے گی۔''

لیکن لازمی نہیں ہے کہ ہمارے قریبی عزیز ہمیں بتائیں کہ عقیدے سے انحراف یا ان کے مذہب پر یقین رکھنے سے انھیں خوشی ہوگی۔ ہم یہ بات وجدانی طور پر جانتے ہیں، کیوں کہ دوسری منفرد انسانی مطابقتیں جواب ہمارے ذہن کی بنیادی ساخت کا حصہ بن چکی ہیں، ہمیں اپنے فیصلے کے بارے میں ان کے ردِعمل کا تخمینہ لگانے میں مدد دیتی ہیں، چاہے وہ منھ سے کچھ نہ کہیں۔ اس کا آغاز ہمارے ذہن کی اس صلاحیت سے ہوتا ہے جس کے تحت ہم ان کے ذہنوں کو ان کے جسموں سے الگ کر دیتے ہیں۔ اس سے بات پھر وہیں پر آجاتی ہے کہ نہ صرف ہم اس پر یقین کرتے ہیں جسے دیکھ نہیں سکتے، بلکہ نادیدہ چیزوں سے بھی تعامل کرتے ہیں۔ ہم دوسروں کے خیالات کو پڑھنے کی صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں چاہے وہ ہمارے سامنے موجود نہ بھی ہوں۔ ایک طرح سے ہم جن سے وابستہ ہوں، ان کے فرضی دوست بن جاتے ہیں۔

دیدوناديد

رُوحوں کا تصور

''انسانی تمدن میں بلند ترین مقام وہ ہے جب ہم یہ جان لیں کہ ہمیں
اپنی سوچوں پر قابو پانا ہے۔'' (چارلز ڈارون)

ذہن اور جسم کی دوئی

چوں کہ ہمیں اپنی بقا کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا ہے، اس لیے ہمارے ذہنوں نے دوسروں کے بارے میں مفروضے تخلیق کرنے کی صلاحیت وضع کر لی ہے۔ ہم یہ سوچ لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرے ہماری طرح ہیں، اپنی مرضی کے مالک جن کے ذہن ہماری مانند ہیں، اگرچہ ہم ان کے ذہنوں کو دیکھ نہیں سکتے۔

اس کے ایک پہلو کو جسم و ذہن کی تقسیم یا دوئی کہتے ہیں، یعنی وہ نظریہ کہ جسم و ذہن الگ الگ کام کرتے ہیں اور دونوں میں آپسی تعامل نہیں ہوتا۔ ہم اس وقت تک روح کا تصور نہیں کر سکتے جب تک ہم ذہن کو جسم سے الگ نہ رکھیں۔ ہم اس لیے ایسا کر پاتے ہیں کیوں کہ ہمارے دماغ اسی طرز سے بنائے گئے ہیں۔

رُوح کا تصور

دماغ کے اگلے حصے میں، آنکھوں کے بالکل پیچھے، دروں بینی، غیر جسمانی خصوصیات سے آگہی، اور ہماری جذباتی کیفیات، خواہشات اور تمناؤں کے سرکٹ موجود ہیں۔ یہ دماغ کا وہ حصہ بھی ہے جس کی مدد سے ہم تجریدی معاملات پر غور کرتے ہیں، جیسے دوسرے لوگوں کے ذہن، ان کے عزائم، عقائد، خواہشات، اور احساسات۔ یہ صلاحیت سیکھی نہیں جاتی بلکہ ہر بچہ اس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ دماغ ذہن اور جسم کو الگ الگ عصبی سرکٹوں میں پیش کرتا ہے۔ اس کی مدد سے ہم جسم کو ذہن سے الگ کر سکتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ذہن و جسم دو الگ الگ زمرے ہیں۔

دماغ کا جانبی حصہ وہ ہے جہاں ہم ٹھوس، اور مرئی چیزوں کی شناخت کرتے ہیں، جیسے ہمارا اپنا چہرہ، اور دوسروں کے جسموں کی حرکات، وغیرہ۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے مدد سے ہم غیر معمولی مظاہر کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں جیسے کسی ایسی چیز کی حرکت جسے حرکت نہیں کرنا چاہیے۔

مذہبی خیالات اس لیے اتنے موثر ہوتے ہیں کیوں کہ وہ بڑے سلیقے سے ذہن و جسم کی اس دوئی میں فٹ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹے بچوں میں جاندار اور بے جان کی تقسیم بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ پانچ ماہ کا شیر خوار کسی صندوق کو خود بخود حرکت کرتے دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہے۔ لیکن یہی بچہ کسی انسان کو حرکت کرتے دیکھ کر حیران نہیں ہوتا۔ بچے کے دماغ کے لیے یہ سوچنا قدرتی ہے کہ زندہ چیزیں اپنے ارادے سے حرکت کر سکتی ہیں لیکن بے جان چیزوں کو انسانوں کی طرح حرکت نہیں کرنا چاہیے۔

بچوں پر کیے جانے والے ایک اہم تجربے میں کوینز یونیورسٹی آئرلینڈ کے ماہرِ نفسیات جیس بیرینگ نے ایک پتلی تماشا تشکیل دیا۔

تماشے میں ایک مگرمچھ کا پتلا ایک چوہے کے پتلے کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس کے بعد بیرنگ نے بچوں سے چوہے کے بارے میں کئی سوال پوچھے۔ کیا چوہا اب بھی کھا پی سکتا

ہے؟ کیا چوہا اپنی ماں کو یاد کرتا ہے؟ بچے جانتے تھے کہ چوہا اب کھا پی نہیں سکتا، لیکن وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی ماں کو یاد کرتا ہے۔ ان چھوٹے بچوں نے ایک مرے ہوئے چوہے کے اندر ایک ایسی ذہنی کیفیت تصور کی جسے وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔

یہ تصور اسقاطِ حمل کے مباحث میں اکثر اس سوال کی شکل میں سامنے آتا ہے: ''اگر آپ کو حمل کے دوران ضائع کر دیا جائے گا تو آپ کیا محسوس کریں گے؟'' بیرنگ کے سادہ مگر خلاقانہ تجربے نے دکھایا کہ اگرچہ بچوں نے ذہن وجسم کی دوئی کا مظاہرہ کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ مافوق الفطرت پر یقین ایسی چیز نہیں ہے جو ہم بچپن میں نشوونما کے دوران اپنے ماحول سے سیکھتے ہیں۔ یہ ایک بنا بنایا آلہ ہے جس کے لیے کسی سماجی ترغیب کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بچوں میں مذہبی بنیاد کا ایک اور پہلو بھی موجود ہوتا ہے۔ چار سالہ بچوں میں سے تقریباً نصف کے فرضی دوست ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن بچوں کے فرضی دوست ہوتے ہیں وہ آگے چل کر سماجی طور پر زیادہ فعال ہوتے ہیں۔ کئی لحاظ سے خدا ہمارا فرضی دوست ہے۔

چاہے ہمارا کلچر ہمیں کسی بھی قسم کی مافوق الفطرت ہستی سے روشناس کروائے، اس کا واسطہ ایک ایسے ذہن سے پڑتا ہے جو پہلے ہی سے یہ قبول کرنے پر مائل ہوتا ہے انسان کی ذہنی زندگی اور صلاحیتیں زندہ یا مردہ جسم سے ماورا ہوتی ہیں۔ مافوق الفطرت مذہبی عقائد ہمارے ذہنوں میں نقب لگا کر داخل ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے دوسرے لوگوں، ان کے خیالات اور ان کے ارادوں کو بھانپنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ذہن اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے، جسم سے الگ رہتا ہے۔

وابستگی کے نظام اور ذہن وجسم کی دوئی کو سمجھنا وہ ابتدائی عمل ہے جس کی مدد سے ہم وہ طریقے جان سکتے ہیں جن کے تحت ہمارے ذہن کو مذہبی عقائد ماننے کے لیے ورغلایا جا سکتا ہے۔

چونکہ آسمانی کتاب کہتی ہے

نادید پر یقین رکھنا

''نئے عہدنامے کی اخلاقیات دل کش ہیں، لیکن اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اس کی کاملیت کا جزوی انحصار ان تاویلات وتعبیرات پر ہے جو اس کے استعاروں اور تمثیلوں پر مڑھ دی گئی ہیں۔''

(چارلز ڈارون)

دولخت ادراک

فرض کریں کہ آپ کے پاس کسی شخص کے ذہن کا حال معلوم کرنے واحد طریقہ یہ ہو کہ وہ آپ کے سامنے بیٹھا ہو۔ اس صورت میں عام انسانی تعلّقات ناممکن ہوں گے۔ یہی بات ہمارے آبا پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ ہم دوسروں کے خیالات اور احساسات کو جانیں، خواہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہی کیوں نہ ہوں۔

اس مقصد کے لیے انسانوں کے اندر یہ منفرد صلاحیت موجود ہے کہ وہ غیر مرئی ہستیوں کی موجودگی کو تسلیم کر سکتے ہیں اور ان کی مناسبت سے اپنا طرزِ عمل تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر روزانہ اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

کیا آپ کے ساتھ کبھی ایسا ہوا کہ آپ کو کسی نے کوئی بات کہی ہو اور اس کا مناسب جواب آپ کے ذہن میں بعد میں آیا ہو؟ کیا آپ کبھی رات کو کروٹیں بدل بدل کر کسی سماجی مسئلے یا نوکری سے متعلّق مسئلے کے بارے میں سوچتے ہیں؟ کیا آپ نے شادی کی تجویز یا تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی ذہنی ریہرسل کی ہے؟

ہم انسانوں میں ایک زبردست صلاحیت یہ پائی جاتی ہے کہ ہم ایک ان دیکھے شخص، باس، بیوی، دوست، کے ساتھ اپنے ذہن کے اندر ایک پیچیدہ تعامل قائم کر سکتے ہیں جو وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ آپ نے کسی کے ساتھ بحث کی۔ آپ غلطی پر تھے، اور اب معذرت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کو پہلے اس کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ آپ اس کی ذہنی ریہرسل کرتے ہیں، اور اس بات کا اندازہ لگانے کے کوشش کرتے ہیں کہ مقابل کیا ردِعمل دکھائے گا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہوتا ہے جب آپ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس عمل کو دو لخت ادراک (decoupled cognition) کہا جاتا ہے، اور یہ مذہبی عقیدے کی کلید ہے۔

ہم اپنے ادراک کو وقت، جگہ اور حالات سے دولخت کر سکتے ہیں۔ یہ صلاحیت بچپن ہی سے پروان چڑھتی ہے اور اسے بچوں کے کھیلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بچہ کسی بوتل کے ڈھکنے کو اُڑن طشتری کہہ سکتا ہے۔ بچہ جانتا ہے کہ یہ بوتل کا ڈھکنا ہے، لیکن وہ حقیقت کو نظر انداز کر کے اسے اُڑن طشتری سمجھنے لگتا ہے، اور اس کے ساتھ اُڑن طشتری کی خصوصیات بھی منسلک کر لیتا ہے۔ بچہ اپنے ادراک کو دولخت کر رہا ہے۔

سٹیج ڈراموں اور فلموں میں اس قسم کے ''عدم یقین کے تعطّل'' (suspension of disbelief) کا اکثر استعمال ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو کچھ سکرین پر ہو رہا ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ دانستہ یہ سمجھتے ہیں کہ فلم کے کردار اصلی اور زندہ ہیں اور یہ کہ کار واقعی پل سے گر کر تباہ ہوگئی، یا ایک کردار ہلاک ہوگیا۔

بالغوں میں یہ طریقۂ کار یادداشت اور منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہے۔ جب

ہم اپنے روزمرہ کے تعلّقات پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہم ماضی و مستقبل کا سفر کر سکتے ہیں اور خیالوں میں مختلف جگہوں پر جا سکتے ہیں۔ ہم اپنے افسر کے ساتھ ملاقات کا وقت یاد رکھتے ہیں۔ ہم وقت سے پہلے ہی اس سے تبادلۂ خیال کی منصوبہ بندی کر لیتے ہیں۔ یہ تمام تعامل ان لوگوں کے ساتھ غائبانہ طور پر ہوتا ہے۔

غیر موجود لوگوں کے ساتھ ذہنی تعامل قدرتی ہے۔ بہت سے لوگ حال ہی میں مرنے والے عزیزوں کے ساتھ اکیلے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہی چیز آگے بڑھ کر آبا کی پوجا اور خدا کی عبادت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ناموجود ہستیوں کے ساتھ تعلّقات کا دائرہ تھوڑا وسیع ہو جاتا ہے۔

ذہنی مکانزموں کا نظریہ

دولخت ادراک ایک حیرت انگیز ذہنی صلاحیت ہے۔ یہ ہمارے ذہن کے اندر ایک ایسا نظام ہے جو نظریۂ ذہن کا مکینزم کہلاتا ہے۔ اس سے قبل کہ ہم یہ تصور کریں کہ کوئی شخص کیسے عمل کرے گا، ہمیں یہ سمجھنا ہوتا ہے کہ وہ کیسے سوچتا ہے۔ اور ہم اکثر اوقات ایسا کر لیتے ہیں۔ ہمارے اندر دوسروں کے خیالات پڑھنے، اس کے عقائد، خواہشات، اور نیت کے بارے میں جاننے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے، اور ہم اسی کی بنیاد پر تخمینے لگاتے ہیں۔

ذرا ان لوگوں کے بارے میں سوچیے جنھیں آپ اچھی طرح سے جانتے ہوں۔ آپ خاصی درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ وہ عین اس وقت کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ اس بارے میں بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ آپ کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں۔ اس صلاحیت نے ممکنہ طور پر ہمارے اجداد کو کون دوست ہے اور کون دشمن ہے کا تعین کرنے، اور پھر اس کے مطابق اپنی رویہ متعیّن کرنے میں مدد دی ہوگی۔

توجہ مرکوز کرنے کی یہ صلاحیت انسان کی انفرادیت کی کلید ہو سکتی ہے۔ ہم وہ واحد جانور ہیں جو دوسروں کے ساتھ پیچیدہ تعاون کرتے ہیں، جس میں ہم نہ صرف دوسروں کے اذہان پڑھ رہے ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ دوسرے ہمارا ذہن پڑھ رہے

ہیں۔ہم اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیتے کیوں کہ یہ سب کچھ بہت آسان لگتا ہے۔لیکن اصل میں ایسا ہے نہیں۔

مثال کے طور پر میں اور آپ طے کرتے ہیں کہ رات نو بجے والا شو دیکھیں گے۔

ہم نے ایک مشترکہ منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ دوسرا اس منصوبے سے کس حد تک وابستہ ہے۔لیکن آپ جانتے ہیں کہ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔اس لیے آپ نے مجھے کہا کہ وقت پر آنا، اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو میرے دیر سے آنے کی عادت سے چڑ ہے۔اور آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی سستی کے بارے میں آپ کی چڑ سے باخبر ہوں۔ جب میں فلم شروع ہونے سے خاصی دیر پہلے پہنچ جاتا ہوں تو آپ مسکراتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میری پابندیِ وقت سے خوش ہوئے ہیں، اور آپ جانتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ میں آپ کی خوشی کو سمجھ سکتا ہوں۔ایک لفظ بھی بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ ایک چھوٹا سا قدم ہے جس میں ہم ایک انسان نما دماغ کا تصور کر سکتے ہیں جس کے اندر دوسروں کے بارے میں خیالات، محسوسات، اور ارادے ہیں۔ہم اس انسان نما دماغ کا تصور کر سکتے ہیں اور اس کے باعث مشترکہ منصوبے تشکیل دے سکتے ہیں۔ہم اس کی مدد سے ایک عالیشان گرجا گھر تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ اس بات سے خوش ہوگا۔اگر ہمیں خوش بختی کا سامنا ہوتا ہے تو ہم جان جاتے ہیں کہ وہ خوش ہے۔

ارادیت

اس سے ملتا جلتا ایک مظہر ''ارادیت'' کا ہے۔ یہ ایک اور غیر معمولی ذہنی صلاحیت ہے۔ یہ کچھ اس طرح سے ہے:

پہلا مرحلہ ''میں سوچتا ہوں۔''

دوسرا مرحلہ ''میں سوچتا ہوں کہ تم سوچتے ہو۔''

تیسرا مرحلہ ''میں سوچتا ہوں کہ تم سوچتے ہو کہ تم سوچتے ہو۔''

چوتھا مرحلہ ''میں سوچتا ہوں کہ تم سوچتے ہو کہ میں سوچتا ہوں کہ تم سوچتے ہو۔''

اب اس طرح سے کوشش کریں:

پہلا مرحلہ ''مجھے امید ہے۔''

دوسرا مرحلہ ''مجھے امید ہے تم اس کتاب کو پسند کرو گے۔''

تیسرا مرحلہ ''میں جانتا ہوں کہ تم اس سے باخبر ہو کہ مجھے امید ہے کہ تم اس کتاب کو پسند کرتے ہو۔''

چوتھا مرحلہ ''تمھیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ میں جانتا ہوں کہ تمھیں اس بات کی خبر ہے کہ مجھے امید ہے کہ تمھیں یہ کتاب پسند ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں حالات کے مطابق تبدیلی ہوسکتی ہیں۔ اب ذرا ایک سماجی صورتِ حال کا تصور کریں۔ ایک عورت ایک ایسے آدمی سے بات کر رہی ہے جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ بیزار کن ہے۔ لیکن مرد کا خیال ہے کہ عورت اسے بہت دل کش سمجھتی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں اس عورت کا خاوند دیکھ رہا ہے، جس کا خیال ہے کہ اس کی بیوی اس مرد کے ساتھ فلرٹ کر رہی ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ برہم ہے اور اس سے بدلہ لے رہی ہے۔ ہوسکتا کہ وہ واقعی یہی کچھ کر رہی ہوتا کہ اپنے خاوند کو دق کر سکے۔

دوسروں کے خیالات اور یہ کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیا سوچ رہے ہوں گے، سے اس قسم کی آگہی سماجی تعلّقات کے لیے بے حد ضروری ہے۔

پہلا مرحلہ ''میں یقین رکھتا ہوں۔''

دوسرا مرحلہ ''میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا چاہتا ہے۔''

تیسرا مرحلہ ''میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اچھی نیت کے ساتھ عمل کریں۔''

چوتھا مرحلہ ''میں چاہتا ہوں کہ تم یقین رکھو کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اچھی نیت کے ساتھ عمل کریں۔''

پانچواں مرحلہ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اس بات سے خبردار رہو کہ ہم دونوں یقین رکھتے ہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اچھی نیت کے ساتھ عمل کریں۔''

نفسیات دان رابن ڈنبر کہتے ہیں کہ تیسرے درجے کی ارادیت ''ذاتی مذہب'' ہے۔لیکن اگر آپ قائل ہو چکے ہیں تو پھر ایک چوتھے درجے کی ارادیت بھی ہے، یعنی کوئی اور آپ کے ذہنی تصور میں اضافہ کر کے آپ سے کہتا ہے کہ آپ یقین رکھیں۔اس سے ''سماجی مذہب'' وجود میں آتا ہے۔

اگر آپ سماجی مذہب کی حقیقت کو تسلیم بھی کر لیں تو یہ آپ سے کسی عمل کا تقاضا نہیں کرتا۔اگر آپ پانچویں درجے کا اضافہ کر دیں گے تو آپ معتقد ہو جائیں گے اور اس طرح آپ نے ''معاشرتی مذہب'' تخلیق کر ڈالا ہے۔لوگ مل کر اپنے فرائض کا احساس کر کے مطالبہ کرتے ہیں کہ دوسرے بھی ایسا ہی کریں۔

آپ بچوں میں بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے سے بہت پہلے اس مشترکہ ارادیت کی صلاحیت دیکھ سکتے ہیں۔کسی چھوٹے بچے کو فرش پر بٹھا دیں اور اس کے سامنے ایک گیند کو آگے پیچھے اچھالیں۔وہ بڑی آسانی سے اس کھیل میں شامل ہو جائے گا۔اب گیند کو اتنا اچھالیں کہ وہ آپ دونوں کی پہنچ سے دور چلا جائے۔بچہ گیند لے آئے گا اور اسے آپ کے ہاتھ میں رکھ کر کھیل دوبارہ شروع کرنے کا اشارہ کرے گا۔

وہ جانتا ہے کہ آپ اس کھیل کو جانتے ہیں اور یہ کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ دوبارہ کھیلنا چاہتا ہے۔

یہ مشترکہ ارادیت یا مشترکہ عمل زبان کی بنیاد بھی ہو سکتی ہے۔اگر آپ اور میں اردو بولتے ہیں تو ہم دونوں جانتے ہیں کہ من مانے طریقے سے منتخب کیے ہوئے لفظ ''کتاب'' کا کیا مطلب ہے۔اگر ہم انگریزی جانتے ہیں تو پھر ہم سب جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسرے جانتے ہیں کہ من مانی اصطلاح ''بک'' کا کیا مطلب ہے۔

دوسروں کے بارے میں نسبتاً درست تخمینے لگانا اپنا کردار ادا کرتا ہے چاہے ہم دوسروں کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ہم نے کسی کو دیکھنے کے لیے علاحدہ، اور مخصوص مطابقتیں اختیار کر لی ہیں، شاید اسی لیے آنکھوں کو ''روح کی کھڑکی'' بھی کہا جاتا ہے۔ہم

دوسروں کی آنکھوں سے ان کے بارے میں بہت سی معلومات اخذ کر سکتے ہیں، جس سے ہمارے اجداد کو اپنے قبیلے یا باہر کے قبیلوں کے لوگوں کے اندر عداوت جاننے، یا دوست دشمن کا فرق پہچاننے کا موقع مل جاتا ہوگا۔ اگر آپ کو کسی ایسے بچے نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا ہو جو آپ کو نہیں جانتا تو آپ نے یہ عمل دیکھ رکھا ہے۔

اس صلاحیت کا مظاہرہ کیمبرج یونیورسٹی کے نفسیات دان سائمن بیرن کوہن نے کیا۔ انھوں نے حیرت انگیز تفصیل سے بتایا کہ ہمارے اندر دوسرے لوگوں کی آنکھیں میں دیکھ کر کئی سو جذباتی کیفیات کو خاصی درستی کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مختصراً، ہم کسی ایسے شخص کے بارے میں پیچیدہ اندازے لگا سکتے ہیں جسے ہم جانتے نہ ہوں۔

منتقلیِ جذبات

خدا یا اپنے باپ سے مدد مانگنا نہ صرف ہماری اندر موجود وابستگی کا تقاضا ہے بلکہ اس کی ایک وجہ ایک اور مطابقت بھی ہے جسے منتقلیِ جذبات کہتے ہیں۔ یہ مذہب کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔

ہم سب غیر شعوری طور پر اپنی زندگی کے تعلّقات کو گذشتہ تعلّقات پر استوار کرتے ہیں۔ جب ہم بچپن میں بولنے اور چلنے کے قابل ہوتے ہیں، ہم دوسروں کے ساتھ تعلّقات کی حکمتِ عملیاں مرتب کرتے جاتے ہیں۔ سابقہ تعلّقات کی یہ حکمتِ عملیاں ہماری شخصیت کی دیرپا خصوصیات کو تشکیل دیتی ہیں۔ ہم انھیں بعد میں آنے والے تعلّقات کے لیے بنیاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر پختہ عمر میں ہم مقتدر شخصیات کے ساتھ اسی طرح سے برتاؤ کرتے ہیں جیسے ہم اپنے بچپن کے برسوں میں کرتے تھے۔ ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقتدر شخصیات ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کریں گی جیسے ہمارے بچپن میں لوگ ہمارے ساتھ کیا کرتے تھے، اور ہم اپنے رویے کو سابقہ تجربے کی روشنی میں ڈھال لیتے ہیں۔ اگر یہ سابقہ تجربات تلخ ہوئے تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ حالیہ مقتدر شخصیات بھی ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گی۔

ہم ان سے اپنے تعلّقات کو اسی روشنی میں ڈھالتے ہیں، چاہے حالیہ شخصیات کا ہم سے سلوک نسبتاً نرم ہی کیوں نہ ہو۔

سوال اُٹھتا ہے کہ انسانی دماغ میں منتقلیِ جذبات کی صلاحیت کیوں پروان چڑھی؟ اس نے کون سے مسائل حل کیے؟ اس نے کون سے مطابقتی مقاصد پورے کیے؟

ہم منتقلیِ جذبات کے ''شارٹ ہینڈ'' کو استعمال کر کے اہم شخصیات کے ساتھ وہ جذبات اور رویے نتھی کر دیتے ہیں جو ہم اپنے بچپن میں اہم شخصیات کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ بہترین حالات میں حالیہ تعلّقات کو ماضی کے تعلّقات پر استوار کرنا، چاہے وہ اصلی تعلّقات ہوں یا فرضی، حالات کے نتائج کا تخمینہ لگانے کا مؤثر طریقہ ہے۔ تصور کریں کہ اس وقت کیا ہوگا جب ہمیں ہر نیا سماجی تعلّق قائم کرتے وقت نئے سرے سے سیکھنا پڑے کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح تعلّقات قائم کیے جائیں۔

ماہرینِ نفسیات روزانہ ایسے متعدد طریقوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جن پر چل کر ماضی کے بیمارانہ تعلّقات حالیہ تعلّقات پر منفی اثر ڈالتے ہیں۔ جب تحلیلِ نفسی کے دوران منتقلیِ جذبات کا یہ عمل دہرایا جائے تو منتقلیِ جذبات کی تفصیلات بذاتِ خود علاج کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کا مذہب سے کیا تعلّق ہے؟ ان تمام ممکنہ منتقلیِ جذبات کا تصور کیجیے جو مذہب کی وجہ سے حرکت میں آتے ہیں۔ عیسائی آسمانی باپ، مریم ماں وغیرہ پر تکیہ کرتے ہیں۔ پھر یہ سوچیں کہ یہ عقائد کس طرح مل کی ذاتی منتقلیِ جذبات بن جاتے ہیں: انسانی والدین، بہن بھائی، اور شریکِ حیات، وغیرہ۔ مذہبی لوگوں کی تحلیلِ نفسی سے اکثر اوقات ماضی کے ایسے تعلّقات سامنے آتے ہیں جن میں مریض کے اندر منتقلیِ جذبات کا عمل اس کے مذہبی خیالات کی تقویت کا باعث بنا ہو۔

اور ہمیں شر سے بچا

خدا کو انسانی چولا پہنانا

''جبلّت کی اساس یہ ہے کہ اس پر عقل سے ماورا ہو کر عمل کیا جاتا ہے۔'' (چارلز ڈارون)

مذہب کے حق میں جانے والی ایک اور انسانی انفرادیت یہ ہے کہ ہم ہر چیز پر انسانی خصوصیات مڑھ دیتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے کہ آپ کو سائے پر چور کا گمان ہوتا ہے، لیکن چور پر کبھی سائے کا گمان نہیں ہوتا؟ اگر آپ دروازہ بند ہونے کی آواز سنیں تو ایسا کیوں ہے کہ آپ ہمیشہ پہلے یہ سوچتے ہیں کہ دروازہ کس نے بند کیا ہے، بہ نسبت اس کے کہ ہوسکتا ہے کہ ہوا سے بند ہو گیا ہو؟ ایسا کیوں ہے کہ ایک بچہ درخت کی ہلتی ہوئی شاخوں کو اپنی کھڑکی سے دیکھ کر خوف سے دبک جاتا ہے کہ بھوت اسے پکڑنے آرہا ہے، اور دنیا بھر کے بچوں کا یہ خیال کیوں ہوتا ہے کہ پلنگ کے نیچے سے بھوت نکل آئے گا؟ بعض ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ پلنگ کے نیچے سے برآمد ہونے والا بھوت ہمارے ماضی کے اس دور کی یادگار ہے جب ہماری نوع

australopithecines کہلاتی تھی۔

اس وقت ہمارا بسیرا درختوں پر ہوا کرتا تھا اور نیچے شکاری جانور ہماری ٹوہ میں منڈلاتے رہتے تھے۔اس دور سے اب تک ہمارے اندر نیچے سے لاحق خطرے کا احساس قائم ہے۔

انسان کے اندر ایک رجحان پایا جاتا ہے جس کے تحت وہ بغیر کسی شہادت کے ہر چیز کو کسی نہ کسی فاعل کی کارروائی قرار دیتا ہے۔اکثر اوقات یہ فاعل خود انسان کی مانند ہوتا ہے۔تجریدی شکلوں یا آوازوں کو کسی فاعل سے منسوب کرنے کی ادراکی صلاحیت سے ہمارے بعید اجداد کی بقا میں مدد ملی ہوگی، کیوں کہ اس طرح وہ خطرے کی نشان دہی کر کے اس سے بچ پاتے ہوں گے۔اس سے وہ ممکنہ خطرے کی جانب سے خبردار اور چوکس رہتے ہوں گے۔بہتر یہ ہے کہ آپ سایہ دیکھ کر چھلانگ لگالیں، بہ نسبت اس کے کہ سایہ آپ کے اوپر چھلانگ لگالے۔

فاعل کی شناخت کا ضرورت سے زیادہ سرگرم آلہ

یہ صلاحیت ہمیشہ تیزی سے (ضرورت سے زیادہ سرگرم) اور آسانی سے (ضرورت سے زیادہ حساس) حرکت میں آتی ہے۔اسے فاعل کی شناخت کا ضرورت سے زیادہ سرگرم آلہ (hyperactive agency detection device) کہا جاتا ہے۔ یہ آلہ مذہبی خیالات کی ترویج میں اپنا حصہ ڈالتا ہے کیوں کہ یہ نہ صرف ان دیکھے فاعل کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔یہ فاعل عموماً انسان نما ہوتے ہیں۔ جب ہمارا دماغ اس قسم کا تعلّق بنالے تو پھر کسی بھوت، بدروح، یا دیوتا کا تصور زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ یہ صلاحیت مطابقتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے ان دیکھی ہستیوں کی موجودگی کو فرض کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہ ہستیاں ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوسکتی ہیں، قدرتی عمل ہے۔اتنا ہی قدرتی یہ فرض کرنا بھی ہے کہ اگر ایسی کسی ہستی سے درخواست کی جائے تو وہ ہماری قسمت بدل سکتی ہے۔درخواست کرنا بڑی آسانی سے دعا میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

ہماری ارتقا شدہ قیافہ شناس خصوصیات اور انسانی شکل کے بارے میں حساس دوسری ادرا کی صلاحیتوں کی مدد سے ہمارا دماغ لگ بھگ ہر جگہ انسان سے ملتی جلتی شکلیں دیکھ سکتا ہے۔

چاند پر بڑھیا، آلو کے چپس پر عیسیٰ (ع) کی تصویر یا رموزِ اوقاف میں مسکراتا ہوا چہرہ:)

حتیٰ کہ لوگ کہکشانی بادلوں کی تصاویر میں بھی ''خدا کی آنکھ'' دیکھ لیتے ہیں۔ یہ وہی تصویر ہے جو اس کتاب کی سرورق پر موجود ہے۔ ایک اور مظہر اس وقت پیش آتا ہے جب ہم معلوم غیر فاعلوں کو بھی فاعلوں کا درجہ دے دیتے ہیں، مثلاً طوفانی بادلوں یا ہواؤں کو۔ آپ کہتے ہیں'' آج آسمان غصے میں لگ رہا ہے'' یا'' یہ ہوا غضب کی ظالم ہے۔'' قدیم یونانی تو اس تصور کو ایک قدم آگے لے گئے۔ زیوس آسمانی بجلی کے کوندے برساتا ہے، پوسائیڈن سمندری طوفان لاتا ہے، اور جل پریاں ملاحوں کو لبھا کر جہازوں کو غرقاب کرتی ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ بھئی، دولخت ادراک اور فعال فاعل سے مافوق الفطرت تصورات کیسے پیدا ہو گئے؟ ہم اپنے اجداد کے ساتھ مکالمے اور سایہ دیکھ کر چھلانگ لگانے سے مافوق الفطرت عقائد تک کیسے پہنچ گئے؟ ہم عام اشیا کو فعالیت دینے پر آمادہ ہوتے ہیں اور خودکار طریقے سے غیر مرئی کو تسلیم کرنے بلکہ اس سے ڈرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ ان مطابقتوں سے لیس سماجی شخصیات کی حیثیت سے ہم ایک خدائی ہستی پر یقین رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہم اس ہستی کو فعالیت اور اپنی روزمرہ زندگی کے جذبات منتقل کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں ہم یہ یقین رکھنے لگتے ہیں کہ یہ ہستی ہمارے ساتھ تعامل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ ہستی غیر مرئی اور بڑی حد تک خیالی رہتی ہے اور اس کے بہت سے حصے واضح طور پر غائب ہوتے ہیں۔ یہ ہستی خدا میں کیسے تبدیل ہوتی ہے؟

استخراجی استدلال اور کم سے کم خلافِ توقع دنیائیں

ہم خالی جگہیں پُر کرتے ہیں۔ یہ استخراجی استدلال ہے۔ بغیر سوچے سمجھے خالی

جگہیں پر کرنا اور چندان کہے بنیادی مفروضوں کے ساتھ عمل کرنا کم سے کم خلافِ توقع دنیاؤں (Minimally Counterintuitive Worlds) کی اساس ہے۔

نیچے دی گئی تصویر کو دیکھیں۔ اس میں لکیریں نہیں ہیں لیکن آپ ایک مربع دیکھتے ہیں۔ آپ نے موجود شواہد کی بنا پر مربعے کا استخراج کیا ہے، اور ایک طرح سے خالی جگہیں پر کی ہیں۔ اگر آپ ایس ایم ایس کرتے ہیں تو آپ استخراجی استدلال کی مثالیں ہر روز دیکھتے ہیں۔

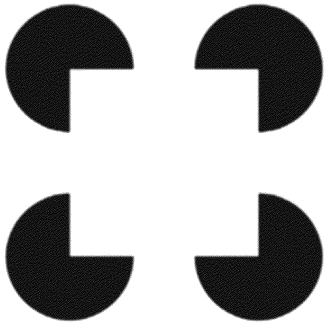

خالی جگہیں پر کرنے کی صلاحیت دوسری مطابقتوں کے ساتھ مل کر نامکمّل تصویر کو مکمّل کر دیتی ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا حصہ معمولی سا مختلف ہے تو ہم پھر بھی اسے قبول کر کے تصویر مکمّل کر لیتے ہیں۔ یہ پھر بھی کم سے کم خلافِ توقع ہے۔ یہ ہماری کم سے کم خلافِ توقع دنیاؤں کی اساس ہے جو دلچسپ اور متوقع کے درمیان ایک موزوں سمجھوتا ہے۔

انسانی دماغ کا ایک انوکھا پن یہ ہے کہ یہ کم سے کم خلافِ توقع دنیائیں جاذبِ توجہ اور یادگار ہوتی ہیں۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ کے گھر کے نزدیک باغ میں بڑا درخت آپ کے کپڑے دھوئے گا، آپ کی کار کی مرمت کرے گا اور آپ کے مستقبل کا حال بتائے گا تو آپ اس پر یقین کرنے کے زحمت نہیں کریں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہاں ''درخت پن'' کے بہت زیادہ خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔

تاہم اگر آپ سے کہا جائے کہ پورے چاند کی راتوں میں یہی درخت آپ کی

دعائیں سنتا ہے، تو ممکن ہے آپ اس پر یقین کر لیں۔ یہ زیادہ یاد رہنے والا بیان ہے۔ کیوں؟ کیوں کہ یہ حقیقت سے صرف بال برابر فاصلے پر ہے۔ اگر چہ درخت سے چند انسانی خصوصیات منسوب کی گئی ہیں، مثال کے طور پر انسانی آواز سننے اور سمجھنے کی صلاحیت اور اس پر ردِعمل دکھانا، لیکن اس کے باوجود درخت درخت ہی رہتا ہے۔ اس کی مرکزی خصوصیت درخت ہی کی رہتی ہے، جو باغ میں کھڑا ہے اور اس میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو کسی درخت میں ہوتی ہیں۔ پھر بھی تھوڑے سے جادوئی پن کا اضافہ دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔

ذرا ان جادو کی کہانیوں کا تصور کیجیے جو آپ نے بچپن میں سن رکھی تھیں: ایک خوبصورت ملکہ جو چڑیل کا روپ دھار لیتی ہے اور آخر میں پھر ملکہ بن جاتی ہے، ایک چڑیل جس کی جھونپڑی مٹھائیوں کی بنی ہوئی ہے جو بچوں کو لبھاتی ہے، سوتیلی بیٹی جو اچانک حسین وجمیل بن جاتی ہے اور وجیہہ شہزادے سے شادی کر لیتی ہے۔

ہماری ان کم سے کم خلافِ توقع دنیاؤں کو تخلیق کرنے کی صلاحیت ہی ہے جو مذہبی خیالات کو جنم دینے اور قبول کرنے اور شک کو زائل کرنے کی بنیاد ہے۔ جیسے بچوں کے لیے جادوئی کہانیوں پر یقین کرنا آسان ہوتا ہے، ویسے ہی تمام مذاہب کا مرکزی ڈھانچا کسی بنیادی شے کی جسمانی، حیاتیاتی، یا نفسیاتی خصوصیات پر مشتمل ہوتا ہے جو باقی اعتبار سے یکساں اور شناسا رہتا ہے۔

کم سے کم خلافِ توقع دنیاؤں میں مافوق الفطرت ہمیشہ عام اور روزمرہ دنیا سے جڑا ہوا رہتا ہے۔ یہ پہلو انھیں نہ صرف یادگار بنا دیتا ہے بلکہ انھیں موت جیسے انسان کے بنیادی وجودی مسائل کی تخفیف کے لیے بھی استعمال کرتا ہے جو عقل کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔

قدیم مصری بلی دیوی باستیت کی پرستش کرتے تھے۔ یہ تصور کرنا کوئی زیادہ بڑی ذہنی چھلانگ نہیں ہے کہ وہ مخلوق جو دن میں اناج کے گودام میں سے مضر چوہوں اور چھپکلیوں

کا خاتمہ کرتی ہے وہ دراصل ایک دیوی ہے جو سورج دیوتا را کے ساتھ آسمانوں کا سفر کرتی ہے اور انسانوں کو بیماریوں اور بدروحوں سے بچاتی ہے، اور را کے دشمن اپاپ اژدہے سے لڑتی ہے۔ بینادی طور پر باستیت ایک بلی ہی ہے جو مرض پھیلانے والے چوہوں اور زہریلے رینگنے والے جانوروں کا خاتمہ کرتی ہے۔ اس کہانی میں ایک چیز تھوڑی ضد وجدانی ہے لیکن بقیہ تمام باتوں کی جڑ حقیقت میں ہے۔ کنواری مریم نے عیسیٰ کو جنم دیا، لیکن مریم کے عورت پن کی باقی چیزیں سلامت رہیں۔

ابراہیمی مذاہب کا خدا ہر جگہ جسمانی طور پر موجود ہے۔ وہ میری سوچوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں سوچ ہی سوچ میں نیک ہوں یا بد۔ لیکن اس کے علاوہ خدا کے بارے میں ہر چیز انسانی ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جس پر وہ ساری چیزیں لاگو ہوتی ہیں جو کسی بھی مرد پر لاگو ہو سکتی ہیں۔ وہ ترش رو، بے صبر اور منتقم مزاج ہو سکتا ہے، بالکل کسی عام انسان کی طرح۔

ہم بغیر سوچے خالی جگہیں پر کرتے جاتے ہیں۔

مذاہب خدا کو ہمیشہ سادہ، عام انسانی خصوصیات تفویض کرتے ہیں۔ عیسائی سمجھتے ہیں کہ عیسیٰ انسان بھی تھے اور خدا بھی۔ تمام انسانی خصوصیات یہاں موجود ہیں، اور ہم خدا کے ساتھ انھی کے وسیلے سے تعلّق قائم کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت تک اس کا احساس نہیں ہوتا جب تک ہم اس کے بارے میں نہ سوچیں اور ایسے ایسی تضادات پر غور نہ کریں جیسے ذہن پڑھنے والے سے دعا مانگنے کی ضرورت۔ خداؤں کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ عام انسانوں کی طرح سوچتے، محسوس کرتے اور عمل کرتے ہیں۔ خداؤں کے بارے میں یہ بنیادی مفروضات ہمیشہ سے قائم ہیں اور ہر مذہب کے لیے بنیادی پتھر کا سا کام کرتے ہیں۔

لوگ دعا کیوں مانگتے ہیں؟ اگر خدا ہماری سوچوں سے واقف ہے تو پھر ہمیں اس سے بات کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ بائبل میں اس سوال کا جواب موجود

ہے: خدا صرف اس وقت سنتا ہے جب اس سے مانگا جائے۔ اور ہم واپس گھوم کر مذہب کو درست ثابت کرنے پر آجاتے ہیں۔

کیا ہم اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں؟

خود فریبی

اگر ہم اپنے آپ کو دھوکا دیں تو پھر بڑی آسانی سے دوسروں کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔ پرعزم سیاست دان بڑے خلوص سے یقین رکھتے ہیں کہ وہ کسی خاص مقصد کی خاطر انتخاب لڑ رہے ہیں۔ درحقیقت، وہ اپنے عزائم اور اقتدار کی ہوس کو اپنے آپ سے بھی چھپا رہے ہوتے ہیں۔

امریکی مصنّف آرتھر ملر کا 1947ء میں لکھا ہوا مشہور ڈراما ''آل مائی سنز'' ایک سچی کہانی پر مبنی تھا۔ یہ ڈراما خود فریبی کی طاقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک فیکٹری کا مالک جان بوجھ کر خراب پرزوں کی ترسیل کرتا ہے جس سے اکیس پائلٹ مارے جاتے ہیں۔ سارا الزام اپنے جیل میں قید شریکِ کار پر ڈال کر وہ تین سال تک اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔ جب سچائی آشکار ہوتی ہے تو وہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان اور فیکٹری کی بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا اور اس پر پوری طرح یقین بھی رکھتا ہے۔

ڈرامے کا موضوع یہ ہے کہ کس طرح اس کی خود فریبی آشکار ہوتی ہے اور اسے حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انسان کی خود فریبی کی صلاحیت مذہبی عقیدے کے لیے بہت اہم ہے۔ اگر بہت سے مذہبی لوگ اپنے ذہنوں کو دیکھ سکیں تو انھیں پتا چلے گا کہ خود فریبی مذہب کی قبولیت میں بڑا کردار ادا کرتی ہے۔

ممکن ہے وہ مورچہ بند دہریے ہوں۔ اگر مذہبی لوگ ایک محافظ خدا پر یقین رکھتے ہیں تو پھر وہ گولیاں چلتے وقت اپنے آپ کو بچانے کے لیے مورچوں میں چھلانگ کیوں

لگاتے ہیں؟ ان کے ذہنوں کا ایک حصہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو نہیں بچائیں گے تو گولیاں مومن اور مشرک میں فرق نہیں کریں گی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو یقین رکھتے ہیں لیکن ان کی جبلّت ان کے جھوٹ کا پردہ فاش کر دیتی ہے۔

مذہبی لوگ صحت کا بیمہ کیوں کراتے ہیں؟ مکان کا بیمہ؟ بہت سے لوگ اپنی زندگیاں ایسے بسر کرتے ہیں جیسے کوئی خدا موجود نہیں ہے۔ ہم سرخ بتی پر رک جاتے ہیں، اپنے بچوں کو حفاظتی کارسیٹوں میں بٹھاتے ہیں، اور ہم اپنے اور اپنے عزیزوں کے تحفّظ کے لیے ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک کار کے پیچھے چسپاں سٹیکر پر غور کیجیے: ''احتیاط: یہ گاڑی سرمستی کے عالم (عیسائیت کے نظریے کے مطابق وہ کیفیت جس میں بنیاد پرست عیسائی زمین سے اوپر اٹھ کر عیسیٰ سے ملاقات کریں گے، Rapture) میں بغیر ڈرائیور کے ہوگی!'' اس وقت بھی یہ ڈرائیور دوسرے ڈرائیوروں کو متنبّہ کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص مذہبی ہے تو دوسرے مذاہب کے خداؤں اور تاریخی خداؤں کے لحاظ سے دہریہ ہے۔ وہ لگ بھگ ہمیشہ دہریوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔

ہم دوسروں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی دہریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ ہم سرخ بتیوں پر رک جاتے ہیں اور یہ فرض نہیں کر لیتے کہ ہم خداوندی امان میں ہیں۔ مغربی دنیا میں ہم اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ مذہبی لوگوں کی اس بات پر کان نہ دھریں کہ وہ مذہب کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب نائن الیون یا ایسے کسی واقعے کے دوران ہم کچھ ایسے لوگوں کا سامنا کرتے ہیں جو واقعی مذہب پر یقین رکھتے ہیں تو ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے۔

نیت پڑھنے میں غلطی

اس شوہر کی طرح جو یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بوریت کی شکار بیوی کسی اور مرد پر ڈورے ڈال رہی ہے، ہم انسانی ارادوں یا مقاصد کو پڑھنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے

کہ ہمیں اکثر اوقات اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں ''آج اس لیے بارش ہوئی کہ میں اپنی چھتری ساتھ نہیں لایا۔'' حتیٰ کہ لامذہب لوگ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں ہونے والے کسی واقعے کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا۔

اس جگہ مقصد اور نیت فرض کر لینا جہاں وہ موجود نہیں ہوتے بچوں میں بہت عام ہے۔ اگر آپ کسی بچے سے پوچھیں کہ جھیلیں کس لیے ہوتی ہیں تو ممکن ہے وہ کہیں، اس لیے کہ مچھلیاں ان میں تیر سکیں۔ پرندے کس لیے ہوتے ہیں؟ گیت گانے کے لیے۔ چٹانیں کس لیے ہوتی ہیں؟ تاکہ جانور ان سے اپنی پیٹھ رگڑ سکیں۔ لاکھوں والدین اس وقت تلملا اُٹھتے ہیں جب ان کا تین سالہ بچہ ہزارویں بار پوچھتا ہے، ''کیوں؟''

بچوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ''وجدانی دہریے'' ہوتے ہیں۔ بچے میں ایک چیز ہوتی ہے جسے مخلوط غایات (promiscuous telelogy) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بنیادی ترجیح ہے جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا کو اس کے مقصد کی رو سے سمجھا جائے۔ اس سے ہمیں بچوں کے نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بچے بڑوں کے کہے بغیر خود بخود خدا اور تخلیق کردہ دنیا کا تصور پیدا کر لیتے ہیں۔ اندر سے ہم سب پیدائشی طور پر تخلیقِ دنیا پر یقین رکھنے والے ہیں۔ عدم یقین محنت مانگتا ہے۔

بڑے بھی بہت زیادہ منطقی نہیں ہوتے۔ انھیں بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز کے پیچھے مقصد تلاش کریں۔ درحقیقت، مذہب کی تعریف ہی میں مقصد کی تلاش کا عنصر موجود ہے۔

مثال کے طور پر لغت میں مذہب کی تعریف کچھ یوں درج ہے: ''کائنات کے سبب، نوعیت، اور مقصد سے متعلّق عقائد کا مجموعہ، خاص طور پر جب کائنات کو کسی ماورائے انسان طاقت کی تخلیق سمجھا جائے۔''

بائبل پر حرف بہ حرف یقین رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ جانوروں کا واحد مقصد انسانوں کی خدمت کرنا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جانوروں نے انسانوں کے ارتقا میں

کردار ادا کیا ہے اور زمین کے ماحول کو برقرار رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

مقصدیت ہی کے باعث ہمیں قدرتی چناؤ کے عمل کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے اس لیے ہمیں یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا ارتقا کس طرح ہوا۔ ہمارے لیے اس بات کو تسلیم کرنا مشکل ہوتا ہے ارتقا جینز میں بتدریج اور اتفاقی تقلیب (mutations) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غیر ضروری طور پر مقصد ڈھونڈنے کی خواہش اور زندگی کے اندھے اور بے مقصد ارتقا کو سمجھنے میں ناکامی کی وجہ سے مذہبی راستا زیادہ آسان لگتا ہے۔

ہمارے اندر ایک پیدائشی ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی میں نظم وضبط ہو اور مذہب اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

تمھاری آرزو پوری کی جائے گی

خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا

''یہ سماجی خصوصیات، جن کا نچلے درجے کے جانوروں میں افادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے، انھیں ہمارے آبا نے بھی اسی طریقے سے حاصل کیا تھا، یعنی قدرتی چناؤ کے طریقے سے۔'' (چارلز ڈارون)

مقتدر کا احترام

ہم مقتدر کا ضرورت سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ یہ بات 1961ء میں ییل یونیورسٹی کے ایک ماہرِ نفسیات سٹینلی ملگریم کے ایک مشہور تجربے میں سامنے آئی۔ ملگریم نے اس تجربے میں یہ ظاہر کیا کہ اگر کسی مقتدر کی طرف سے حکم دیا جائے تو دو تہائی سے زیادہ افراد ایک بے سہارا ''طالب علم'' کو اس کی مرضی کے خلاف بجلی کا شاک پہنچاتے رہیں گے۔

اگر آپ اس تجربے سے ناواقف ہیں تو چند لمحے صرف کر کے اسے انٹرنیٹ پر دیکھ لیجیے۔ آپ کو اصل تجربے اور ملگریم کے نتائج دیکھ کر حیرت ہوگی۔

احترام اور رعب و دبدبہ کے احساسات ہمارے وجود کا حصہ ہیں، جن کا مقصد

مقتدر لوگوں کی جانب ہمارے رویوں کو ڈھالنا ہوتا ہے۔ ان احساسات کو مذہب خوب استعمال کرتا ہے۔ اپنے ماں باپ کی عزت کرو۔ اپنے خدا یا دیوتا کی ثنا بیان کرو۔ اس کے آگے سر جھکا دو۔

اخلاقیات

لغت میں مذہب کی تعریف کا دوسرا حصہ کچھ یوں ہے: ''جس میں اکثر اوقات کوئی اخلاقی ضابطہ پایا جاتا ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے معاملات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔'' ایسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ مذہب کے بغیر انسان لاقانونی اور اخلاق سے عاری ہو جائے گا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔

ہم پیدائشی طور پر نیک چلن جانور ہیں۔ ہمیں اخلاق سے عاری وحشی بننے سے بچنے کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہمارے آبا کو غلط اور صحیح کا اندازہ نہ ہوتا تو وہ سماجی گروہوں میں کبھی بھی سلامت نہ رہ سکتے۔

آئینہ دماغی خلیوں (mirror neurons)، جن کا ذکر ہم نویں باب میں کریں گے، کے علاوہ بھی ایسے کئی شواہد موجود ہیں جو اس بات کو رد کرتے ہیں کہ اخلاقیات صرف سیکھا ہوا رویہ ہے، اور اس کے پیدائشی پہلو نہیں ہیں۔

انسانی غرور ہمیں یہ سوچنے پر مائل کرتا ہے کہ ہم واحد اخلاقی ہستیاں ہیں۔ لیکن دوسرے جانوروں کے اندر بھی ہمدردی، رحم، غم، مدد، معافی، بھروسا، بدلہ، انصاف کا احساس، انتقام، کینہ، وغیرہ جیسے جذبات پائے جاتے ہیں۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جنھیں انسانی اخلاقیات کا ماخذ قرار دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ انھیں بطور ارتقا شدہ اخلاقی نظاموں کے خالق کے طور پر دیکھا جانا چاہیے جو کسی خاص نوع کے رویے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

اخلاقی رویوں کا ارتقا معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ معاشرتی پیچیدگی اخلاقی پیچیدگی کو جنم دیتی ہے۔ اور ہم بہت زیادہ معاشرتی نوع ہیں۔

ییل یونیورسٹی کے نفسیات دان پال بلوم اور ان کی ٹیم نے دریافت کیا ہے کہ تین ماہ کے بچوں میں بھی غلط اور صحیح، اچھے اور برے اور انصاف اور ناانصافی کا پیدائشی احساس موجود ہوتا ہے۔

جب ان بچوں کو ایک پتلا دکھایا گیا جو ایک پہاڑی کے اوپر چڑھتا ہے اور ایک اور پتلا یا تو اس کی مدد کرتا ہے یا رکاوٹ ڈالتا ہے، تو بچوں نے اپنا رخ مددگار پتلے کی طرف کر لیا اور رکاوٹ ڈالنے والے پتلے سے منھ موڑ لیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ سماجی قدر پیمائی، اور ایک لحاظ سے اخلاقی ردِعمل کا فیصلہ کرنے کے اہل تھے۔ پال بلوم نے لکھا، ''انسانوں کے لیے اکثر اوقات مل کر کام کرنا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے اچھا یا برا ہونے کو جانچنا ایک مطابقت ہے۔ اس سے ایک وجہ فراہم ہوتی ہے کہ بنیادی اخلاقی تصورات کو پیدائشی سمجھا جائے۔''

ہم نے آپ کو پانچویں باب میں ایک بچے کی مثال دی تھی جو فرش پر گیند سے کھیلتا ہے۔ یہ مثال مائیکل تو ماسیلو کی تحقیق سے لی گئی تھی، جو جرمنی کے میکس پلانک انسٹی ٹیوٹ میں ارتقائی علمِ بشریات کے شریک ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ننّھے بچوں پر تحقیق کی ہے جس سے بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم پیدائشی ایثار پسند ہیں جو بڑے ہونے کے بعد خودغرضی سیکھتے ہیں۔

تو ماسیلو کے گروپ نے پیچیدہ رویوں میں بچوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر ظاہر کیا ہے کہ بچوں میں انصاف پسندی کا واضح احساس موجود ہوتا ہے۔ فیلکس ورنیکن کی ویڈیو میں یہی نکتہ دکھایا گیا ہے کہ دو سال سے کم عمر بچے اپنی ماؤں سے دامن چھڑا چھڑا کر ایک لمبے شخص کو دراز کھولنے میں مدد دیتے ہیں۔

ہمارے اخلاقی نظام ہماری پیدائشی گرامر کی طرح ہیں، ہم سب کے اندر زبان سیکھنے کی صلاحیت موجود ہے، اور ہم اپنی ثقافت کی زبان سیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم سب کے اندر اخلاقی نظام موجود ہیں، اور ہم اپنی ثقافت کی اخلاقی قدریں سیکھتے ہیں۔ ہم ان کی مشق

کر کے انھیں اپنے وجود کا حصہ بنا لیتے ہیں، اور وہ قدریں ہمارے وجدانی، خودکار اور جذباتی ردِعمل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہم مذہب کے بغیر بھی غلط اور صحیح کا فرق کر سکتے ہیں۔

ہماری اخلاقیات ایک دہرا نظام ہے جس کے اندر شعوری اور غیر شعوری طریقۂ کار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ''بعد از عمل ضمیر'' کا نظام بھی موجود ہے جو دماغ کے ایک خاص حصے میں پایا جاتا ہے۔

ہمارے جذباتی اور اخلاقی نظام اوربیٹوفرنٹل کورٹیکس (orbitofrontal cortex) میں پائے جاتے ہیں، جو دماغ کے وسطی نچلے علاقے میں واقع ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو ماحول، اور خاص طور پر سماجی ماحول اور اس کے اندر ہمارے مقام کا مسلسل جائزہ لیتا رہتا ہے۔ جب ماحول میں تبدیلی ہوتی ہے تو ہم خودکار طریقے سے ردِعمل دکھاتے ہیں۔ اگر تبدیلی مثبت ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اگر منفی ہے تو ہم اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ یہ ایک فوری جذباتی قدر پیمائی کا عمل ہے۔

دماغ کے بہت سے حصے ہمارے اخلاقی ردعمل کے ذمے دار ہیں، جن میں نقصان اور ناانصافی سرِفہرست ہیں۔ اگر ہم ان کی خلاف ورزی ہوتی ہوئی دیکھیں تو سب سے پہلے ردعمل دکھاتے ہیں۔ تمام لوگ بعض اشاروں پر خودکار طریقے سے ردِعمل دکھاتے ہیں، تاہم سیکھے ہوئے ثقافتی فرق اس ردعمل کی شدت کا تعین کرتے ہیں۔

اگرچہ ہم سب مقتدر قوتوں کے سامنے جھکتے ہیں، تاہم جیسا کہ ملگریم کے تجربات نے ثابت کیا ہے، ہمارے اندر اخلاقی جذبات موجود ہوتے ہیں جو ہمیں مقتدر قوتوں کے ساتھ تعلّقات مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں، جس سے ہمیں اپنے گروپ کے اندر وفاداری ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم ان کے کاموں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان کا دفاع کرتے ہیں۔ ہم خارجی گروہوں کی شناخت بھی کر سکتے ہیں جن کی طرف سے ہم محتاط رہتے ہیں، اور اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ وہ مشکوک ہیں اور ان پر اس وقت تک اعتبار نہ کیا جائے جب تک وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر دیں۔ مذہبوں نے ایک ایسے بنے بنائے مکینزم کا

کردار ادا کیا ہے جس کے تحت موت کے مستحق خارجی گروہوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

ہمارے خودکار اخلاقی جذبات کا ایک اور پہلو صفائی ستھرائی ہے۔ غالباً یہ ہمارے اجداد کے اندر سڑے ہوئے گوشت سے پیدا ہونے والے ناگواری کے احساس سے پیدا ہوئی، جس کا مقصد ہمیں بیماریوں سے بچانا تھا، لیکن ناگواری کا یہ احساس سماجی تعلّقات میں بھی در آیا۔ ناگواری ایک طاقتور اخلاقی جذبہ بن گیا، جس سے تنقید اور مذمت کا کام لیا جانے لگا۔ اس کا نشانہ عام طور پر ایسے افراد کو بنایا جاتا تھا جو گروہ سے باہر کے ہوں۔ صفائی کا احساس مذہبی لوگوں، جگہوں، اور چیزوں پر بھی لاگو کر لیا گیا، اور ہمیں اس وقت تکلیف ہوتی تھی جب مقدس سمجھی جانے والی رسومات کی خلاف ورزی کی جاتی تھی یا ان میں بدعت کی جاتی تھی۔

ہمارے باشعور اخلاقی احساسات وہ عقلی طریقۂ کار ہیں جن کے تحت ہم اپنے خودکار جذباتی ردعمل کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے جمالیاتی فیصلوں کے اخلاقی ردعمل کا تقابل کریں۔ جب آپ اپنی کوئی پسندیدہ پینٹنگ دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو اچھی لگتی ہے اور آپ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب پوچھا جائے کیوں، تو آپ اس کی توجیہہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ محض حق بجانب ثابت کرنے کی کوششیں ہیں، جن کا ممکن ہے کہ اس مثبت خودکار ردعمل سے کوئی تعلّق نہ ہو جو پینٹنگ دیکھ کر آپ کے اندر پیدا ہوا تھا۔

ہمارے اندر اسی طرح کے خودکار اخلاقی ردعمل موجود ہیں، اور ہم کسی اچھے وکیل کی طرح انھیں درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ذہن کا ''وکیل'' حصہ، جو سیریبرل کورٹیکس (cerebral cortex) کہلاتا ہے، دماغ کی بیرونی تہہ ہے۔ یہ ہمیں کسی اخلاقی ردعمل کی وجوہات بتاتا ہے اور ہمارا کیس مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے دماغ کا ایک حصہ بعض اوقات ہمارے جذباتی ردعمل پر غالب آجاتا ہے، اور ہم اس کی وجہ سے کسی ایسے شخص کو معصوم قرار دے سکتے ہیں جس سے ہم ''جبلی'' طور پر نفرت کرتے ہوں۔

چونکہ ہمارے جذباتی عمل کا بڑا حصہ غیر شعوری ہوتا ہے، مذہب ہمیں بظاہر اتفاقی احساسات کی شعوری توجیہات فراہم کر کے ہماری زندگیاں آسان بنا دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص غیر مذہبی ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت زیادہ نیک چلن بھی ہو۔ لیکن اگر آپ بائبل کے الفاظ پر من وعن عمل کریں تو آپ اپنی خودسر بیٹی کو کنیز بنا کر بیچ بھی سکتے ہیں (ہجرت 7:21) دوسرے مذاہب میں بھی ایسے عجیب وغریب احکامات موجود ہیں۔ قدیم مذہبی کتابیں ایسی اخلاقی قدروں سے بھری پڑی ہیں جو آج کل کے انسان کو غیر اخلاقی لگتی ہیں۔ آپ مذہبی فرمودات کی جتنی کم پیروی کریں گے اور اپنی بنیادی اخلاقی جبلّت کو جتنا زیادہ استعمال کریں گے، آپ اتنے ہی زیادہ اخلاقیات کی پاس داری کرنے والے ہوں گے۔

خالص اخلاقیات وہ کرتی ہے جسے وہ درست سمجھتی ہے، چاہے ہمیں کسی نے ایسا کرنے کے لیے کہا ہو یا نہیں۔ مذہبی اخلاقیات وہ کرتی ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہو۔ مذہبی طاقت ہمیں احکام پر چلنے کے لیے ٹھوس وجوہات فراہم کرتی ہے۔ مذہب ہمیں ایک ایسے گروہ کا حصہ بننے کا موقع فراہم کرتا ہے جسے دائمی صلہ ملتا ہے، یا یہ ہمیں جہنّم کی آگ میں ہمیشہ جلنے سے بچا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو پہلے مذہبی تھے، بتاتے ہیں کہ مذہب سے تعلّق رکھنا لامذہبیت سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ مذہب کے تحت فیصلے کرتے ہوئے بہت کم ذہنی توانائی خرچ کرنا پڑتی ہے۔

رشتے داری کی نفسیات

انسانوں کا ارتقا ایسے زبردست قسم کے ذہنی مکینزموں کے ساتھ ہوا ہے جو ہمیں رشتے داروں کو پہچاننے، ان کے ساتھ تعلّق جوڑنے، اور رشتے داروں کو اجنبیوں پر ترجیح دینے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ بات ایک پرانی کہاوت میں کھل کر سامنے آتی ہے: ''میں اپنے بھائی کے خلاف، میرا بھائی اور میں اپنے کزن کے خلاف، میرا کزن اور میں اجنبیوں کے خلاف۔''

یہ رشتے دارانہ احساسات نہ صرف ہماری بقا بلکہ ہمارے ان جینز کی بقا کے لیے بھی ضروری ہیں جو ہمارے رشتے داروں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ہمارا ارتقا اس ڈھب

سے ہوا ہے کہ ہم ان لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کے اندر ہمارے جین ہوں۔

مذاہب نے ان رشتے دارانہ تعلّقات کو استعمال کیا ہے۔ رومن کیتھولک مذہب میں اس کی ایک عمدہ مثال موجود ہے۔ ننوں کو ''سسٹر'' حتیٰ کہ ''ماں'' تک کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پادری ''باپ'' ہیں، جب کہ راہب ''بھائی'' کہلاتے ہیں۔ پوپ ''مقدس باپ'' ہے، اور خود مذہب کو ''مقدس مادر چرچ'' کہا جاتا ہے۔

رشتے دارانہ جذبات کا استعمال آج کے خودکش حملہ آوروں کی بھرتی اور تربیت اور اپنے گروہ کی اطاعت میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس دوران رشتے داری کے کنایوں کو توڑا موڑا جاتا ہے۔ شعلہ بیان بھرتی کار اور تربیت کار مصنوعی رشتوں کے دھڑے تخلیق کرتے ہیں۔ ان میں خودساختہ بھائی شامل ہوتے ہیں جو اپنے برادر مسلمانوں اور بہنوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر برہم اور اپنے اصل خاندانوں سے دور ہوتے ہیں۔ ایسی شہادت کی کشش صرف متعدد حوروں کے جنسی تخیّل تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس سے منتخب رشتے داروں کو جنت کا ٹکٹ کٹانے کا موقع بھی ملتا ہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس کی اٹھارہ جون 2010ء کی ایک رپورٹ اس بات کو بڑی خوبی سے ظاہر کرتی ہے: ''القاعدہ سے منسلک ایک شدت پسند نے اپنے باپ کو قتل کر دیا کیوں کہ وہ عراق میں امریکی فوج کے مترجم کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔''

اس کیس میں مذہب کی تخلیق کردہ رشتے داری اصل رشتے داری پر غالب آ گئی، جن سے نہ صرف انفرادی جذبات بلکہ معاشرے کی طرف سے عائد باپ کو قتل کرنے کی ممانعت بھی پسِ پشت چلی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کس حد تک خطرناک ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں نائن الیون سے پہلے انسان کے ہاتھوں سب سے زیادہ انسانی زندگیوں کا نقصان مذہب کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس واقعے میں جونز ٹاؤن میں 918 لوگ ہلاک ہوئے تھے، جن میں سے 909 نے سائنائیڈ پی کر خودکشی کی تھی۔ پیپلز ٹیمپل نامی یہ

گروپ جم جونز نامی ایک شخص نے قائم کیا تھا۔

ان 909 لوگوں نے اپنی زندگیوں کا سودا ایک پاگل شخص کے ہاتھوں کس طرح کرلیا؟

مہنگا سودا

آپ کسی ایسے شخص پر کیسے بھروسا کرتے ہیں جو اس کے بدلے میں کچھ کرنے کا وعدہ کرتا ہو؟ آپ کا بھروسا اس وقت بڑھ جاتا ہے جب وہ شخص حقیقی، مخلصانہ، اور مہنگا وعدہ کرے۔ جونز نے ہر شخص کو ایک ہزار ڈالر پیشگی اور ہیرے کی انگوٹھی دی، اور خدا کے نام پر خود کو کوڑے مارے، اور اپنے مریدوں کو جنوبی امریکہ میں ایک نیا شہر بسانے لے گیا۔

حقیقی، مخلصانہ اور مہنگے وعدے ہمارے تعلّقات کا حصہ ہیں۔ مذہب انھیں بڑی عمدگی سے استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں، اور اپنا خون، پسینہ، محنت، آنسو، دولت، حتیٰ کہ اپنے رشتے دار تک قربان کر دیں۔

مجھے کیسے پتا چلے گا کہ آپ مذہب، اور اپنے دینی بھائی یعنی میرے ساتھ کس حد تک وابستہ ہیں؟ اس صورت میں، اگر میں مذہبی رسومات میں آپ کی حقیقی، مہنگی شرکت دیکھ لوں۔ ایسی رسومات جو اکثر لمبی، پیچیدہ، غیر آرام دہ، اور مالی اور جسمانی طور پر مہنگی ہوتی ہیں۔

جب بھی تم میں سے دو یا دو سے زیادہ اکٹھے ہوں

مذہبی رسوم کے ذریعے دماغی کیمسٹری کا استعمال

''مختلف زبانوں اور مخصوص انواع کی تشکیل متوازی عمل ہیں اور دونوں
ایک بتدریج عمل کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں۔'' (چارلز ڈارون)

مذہبی خیالات اور عقائد کی طرح مذہبی رسومات بھی ایسے ذہنی مکینزموں کی ذیلی پیداوار ہیں جو اصلاً دوسرے مقاصد کے لیے بنے تھے۔

رسومات وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہو کر عقائد کو برقرار رکھنے، ان کی ترسیل و تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انفرادی ذہن مذہبی خیالات کی تخلیق، قبولیت، اور ان پر یقین رکھنے میں کتنا اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر یہ عمل یہیں روک دیا جائے تو مذہبی عقائد پر ڈھیلے ڈھالے طریقے سے عمل کیا جائے۔ لیکن رسومات ایسے دماغ کیمیائی مادوں کو خارج کر کے، جو شدید جذباتی کیفیت پیدا کرتی ہیں اور خودداری، لطف، خوف، تحریک، درد سے نجات اور وابستگی جیسے احساسات کو جنم دیتے ہیں، ایک ایسا مجموعہ تخلیق کرتے ہیں جو انفرادی اجزا سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

دماغی کیمسٹری کو رسومات کے ذریعے کنٹرول کرنا

رسومات کی اجتماعی نوعیت ایسے انفرادی دماغوں پر اثر ڈالتی ہے جو پہلے ہی سے تیار ہوتے ہیں اور انھیں باہمی تقویت کے عمل سے مزید مضبوط بناتی ہے، جس سے شعوری اور غیر شعوری قوتوں کا ایک زوداثر مجموعہ تیار ہو جاتا ہے۔

ایک لحاظ سے دنیا میں صرف ایک اصل مذہب موجود ہے جو ہمارے جنگلی اجداد نے آج سے پچاس تا ستر ہزار سال قبل افریقہ میں تخلیق کیا تھا۔ اس قدیم ماضی کا اندازہ آج کے دور کے وحشی انسانوں کی رسومات کا مطالعہ کر کے لگایا جا سکتا ہے۔

ان گروہوں میں سب سے پہلے افریقہ کے کنگ سان ہیں جو اب سے تھوڑا عرصہ قبل تک شکار کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ دوسرا ایک ایسا قبیلہ ہے جو بیسویں صدی تک دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہ خلیجِ بنگال میں جزائرِ انڈمان میں رہتا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی باقیات ہیں جو سب سے پہلے افریقہ چھوڑ کر آئے تھے اور جزیرہ نما عرب سے گزر کر ہندوستان پہنچے اور پھر وہاں سے انڈونیشیا اور بالآخر آسٹریلیا جا آباد ہوئے۔ تیسرے آسٹریلیا کے اصل باشندے ہیں، جو جینیاتی مطالعوں کے مطابق افریقہ سے ایک لہر کی شکل میں آئے تھے۔

ان تینوں قبائل کے مذاہب حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے ہیں۔ تینوں کی بنیاد رقص ونغمہ اور وجد پر ہے۔ کیوں؟ بظاہر ان چیزوں سے ہمارے دماغ سے سب سے طاقتور کیمیائی مادے خارج ہوتے ہیں، جو لطف، خوف، اعتماد، محبّت، خودداری، اور وابستگی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے اجداد نے اتنا طاقتور مذہب دریافت کیا تھا کہ اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس ابتدائی مذہب کی بازگشت آپ کو دنیا میں پائے جانے والے تمام مذاہب میں سنائی دے گی۔ جس طرح ہم اس چھوٹے سے گروہ کی اولاد ہیں جو ایک لاکھ سال قبل افریقہ کے وسیع میدانوں میں رہتا تھا، اسی طرح تمام مذہب اس گروہ کے دریافت کردہ رقص ونغمہ اور وجد سے استفادہ کرتے ہیں۔

رسومات کی دماغی کیمسٹری

دماغ کے اندر خلیے کیمیائی مادوں کی مدد سے آپس میں پیغامات کی ترسیل کرتے ہیں جنھیں نیوروٹرانسمیٹر کہا جاتا ہے۔

مرکزی اعصابی نظام رکھنے والے ہر جانور کے اندر ایک کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے سیریٹونن (seritonin) کہتے ہیں۔ یہ نیوروٹرانسمٹر کا قدیم ترین زمرہ ہے جسے مانو امین (monoamines) کہا جاتا ہے۔ سیریٹونن برین سٹیم کے اندر ہوتا ہے اور یہاں سے یہ دماغ کے اندر مختلف وجوہات کی بنا پر سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ ان میں بار بار ہونے والی پٹھوں کی حرکت کے سگنل شامل ہیں۔ لیکن ہمارے موضوع سے متعلّق زیادہ اہم بات یہ ہے سیریٹونن سماجی ردِعمل کی مناسبت سے ہمارے خودداری کے جذبے کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ اگر مجھے نوکری سے نکال دیا جائے تو میرے دماغ میں سیریٹونن کی مقدار کم ہو جائے گی، اور میرے سماجی رتبے میں کمی کی وجہ سے میرے اندر ممکنہ طور پر ڈیپریشن، چڑچڑاپن، اور اضطرار کی کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر مجھے امریکہ کا صدر بنا دیا جائے تو دماغ میں سیریٹونن کی مقدار بڑھ جائے گی، اور میں اپنے آپ کو زیادہ باوقار محسوس کرنے لگوں گا۔ ڈیپریشن کی نئی ادویات، جیسے پروزیک، سیریٹونن کی مقدار میں اضافہ کرتی ہیں۔ اب جب کہ آپ خاموشی سے یہ کتاب پڑھ رہے ہیں تو آپ کے برین سٹیم میں سیریٹونن کے خلیے تین چکر فی سیکنڈ کی رفتار سے چل رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ چل پھر رہے ہوں تو یہ مقدار بڑھ کر پانچ چکر فی سیکنڈ ہو جاتی ہے۔ جب آپ بھاری ورزش کرتے ہیں تو سیریٹونن کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک اور مشہور نیوروٹرانسمیٹر ڈوپامین (dopamine) ہے اور یہ لطف کے احساس سے منسلک ہے۔ ہمارے دماغ کا وہ حصہ جہاں ڈوپامین زیادہ پائی جاتی ہے وہ نیوکلیئس ایکمبنز (nuleus accumbens) کہلاتا ہے، اور یہ خوراک، سیکس، اور منشیات جیسے تعاملوں سے حرکت میں آجاتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جو فاسٹ فوڈ پر ''دوبارہ، دوبارہ'' کا ردعمل

دکھاتی ہے۔لیکن ڈوپامین صرف لطف رساں کیمیائی مادہ ہی نہیں ہے۔ یہ پٹھوں کی کارکردگی، فائن موٹر حرکات، بار بار دہرائے جانے والے رویے (repetitive compulsive behavior)، بچاؤ، اور بعض افعال کی بے روک دہرائی جیسے کاموں میں کردار ادا کرتا ہے۔ نیورولوجسٹ اولیور سیکس نے ڈوپامین سے ملتے جلتے ایک کیمیائی مادے کی مدد سے کیٹاٹونیا کے مریضوں کو وقتی طور پر بحال کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے اس کے بارے میں کتاب لکھی، جس پر فلم بھی بنائی گئی۔ ڈوپامین ہمارے دماغ میں چیزوں کو اہمیت کے لحاظ سے نشان زد بھی کرتی ہے، انھیں نمایاں خصوصیات بخشتی ہے، اور صلے کی توقع رکھتی ہے۔

آخری مانو امین نیوروٹرانسمٹر اپی نیفرین اور نار اپی نیفرن (epinephrine and norepinephrine) ہیں، جنھیں ایڈرینالین اور نار ایڈرینالین (adrenaline and noradrinaline) بھی کہا جاتا ہے۔ ایڈرینالین ہمارے دل کی دھڑکن میں اضافہ کرتی ہے، ہمیں بے چین بناتی ہے، ہماری توجہ کو مرکوز کرتی ہے، اور جسم سے پسینہ بہاتی ہے۔ یہ ہمیں وقتی توانائی فراہم کرتی ہے، ہمیں بھاگنے یا لڑنے کے لیے تیار کرتی ہے، اور بعض اوقات ہم سے ناممکن قسم کے جسمانی کام کرواتی ہے، جیسے ایک ماں کا کار اٹھا کر اپنے بچے کو نیچے سے نکالنا۔

آکسیٹوسین (oxytocine) ایک اور دماغی کیمیائی مادہ ہے جو مذہبی رسومات میں رابطہ گری کا کردار ادا کرتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے دوران ماں کے دماغ میں آکسیٹوسین بہت بڑی مقدار میں خارج ہوتی ہے۔ دودھ پلانے کے دوران بھی آکسیٹوسین خارج ہوتی ہے۔ آکسیٹوسین ماں کی دوسری وابستگیوں کو ہلکا کر کے اس کی توجہ بچے پر مرکوز کراتی ہے۔

آکسیٹوسین جنسی ہیجان کے دوران بھی پیدا ہوتی ہے اور جنسی تسکین کے دوران اس کی خاصی مقدار خارج ہوتی ہے۔

آکسیٹوسین دونوں اصناف میں اعتماد، محبّت، بھروسا، اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ یہ خوف کم کرتی ہے اور ممکنہ طور پر ہمارے تمام سماجی جذبات پر مثبت اثر ڈالتی

ہے۔ جو مذہب آکسیٹوسین کو استعمال کرسکتا ہو، اس کے ہاتھ میں انسان کے سب سے طاقتور، سب سے لطف انگیز، اور سب سے خطرناک جذبات کی کلید آجاتی ہے۔

دماغ میں ایک اور قسم کے کیمیائی مادے بھی ہوتے ہیں جو مذہب کے لیے اہم ہیں۔ انھیں انڈورفنز (endorphins) کہا جاتا ہے جو ہماری اندرونی افیون ہیں۔ انڈورفنز زخم لگنے کی صورت میں درد کو کم کرتے ہیں، اور یہ ورزش، ہیجان، درد، لمس، ہنسی، موسیقی، جنسی تسکین اور مرچ کے ردِعمل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی ایتھلیٹ کے دماغ کا لمبی دوڑ کے بعد معائنہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ اس کے اندر انڈورفنز کے ریسیپٹر متحرک ہو گئے ہیں۔ انڈورفنز کی مقدار میں اضافے کو ''رنرز ہائی'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خاص وجہ سے بھاری ورزش کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے اجداد کے لیے انڈورفنز کا اخراج بقا کے لیے ضروری تھا۔ بھاری ورزش عام طور پر چوٹ کا باعث ہوتی ہے، چاہے وہ شکار کر رہے ہوں یا اپنے آپ کو کسی درندے سے بچا رہے ہوں۔ اگر چوٹ لگ جائے تو ہمارا دماغ اس کے لیے تیار ہوتا ہے اور ایک دردکش مادہ فراہم کرتا ہے جس سے ہمیں اختیار اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختتامِ ہفتہ کو پارٹیاں منانے والے (weekend warriors) اپنے درد کی آخری حد سے گزر جانے کے بعد بھی جشن مناتے رہتے ہیں۔ انھیں اگلے دن درد کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے اجداد بھی فوری خطرے سے محفوظ رہتے تھے۔

انڈورفنز سماجی وابستگیوں کو مضبوط کرتے ہیں اور ڈوپامین کے اخراج میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ نیوروٹرانسمٹرز میں عام ہے۔ اگرچہ ہر ایک کا اپنا مخصوص کام ہے، لیکن یہ ایک دوسرے کے اخراج میں مدد دیتے ہیں۔ اس طرح وہ منفرد مجموعے وجود میں آتے ہیں جسے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک مقصد مذہبی رسومات ہیں۔

اگرچہ ہمارے اجداد نیوروکیمسٹری کا علم نہیں رکھتے تھے، لیکن پھر بھی انھوں نے

کسی طرح ایسے افعال کے مجموعے تلاش کر لیے جو سیر یٹونن، ڈوپامین، اپی نیفرن، نار اپی نیفرن، آکسیٹوسین، اور انڈورفنز کا اخراج کرتے ہیں۔ تمام معاشروں میں مذہبی رسومات کے دیرپا چلن کو سمجھنے کی کنجی یہی ہے کہ کوئی اور چیز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

انگریزی لفظ religion کا ماخذ غالباً لاطینی لفظ religare ہے، جس کا مطلب ہے ''باندھنا'' ہمارے اجداد نے ایسی مذہبی رسومات ایجاد کیں جنھوں نے ہماری دماغی کیمیا کو ایک منفرد طریقے سے قابو میں کر لیا، جس سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور سماجی وابستگیاں مستحکم ہوتی ہیں۔

ایک معاندانہ ماحول میں زندہ رہنے کے لیے ہمارے اجداد نے سماجی گروہ تخلیق کیے، جن سے نئے قسم کے مسائل پیدا ہو گئے۔ گروہوں میں ذاتی اختلافات اور تنازعات پیدا ہو گئے، جنھیں اگر حل نہ کیا جاتا تو پورے گروہ کا وجود خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ لیکن ایک سماجی نوع کی حیثیت سے انتشار اور نزاع ہمارے ارتقائی مفاد میں نہیں تھا۔ اگر کوئی فرد گروہ کی بقا کے خلاف کام کرتا تو اس کو سیدھی راہ پر لانے والوں کو یہ خطرہ لاحق ہوتا تھا کہ کہیں اس فرد کے دوست اور رشتے داران کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔ لیکن نادیدہ طاقتیں۔۔ مردہ اجداد یا دیوتا۔۔ اس فرد کی سزا کا تعین کر سکتے تھے، اور مستقل نگرانی کے بغیر بھی گروہ کو مزید مضبوط کر سکتے تھے۔

حالیہ تحقیق اس مفروضے کو تقویت دیتی ہے۔ سزا پر مذہب کے اثرات کے بارے میں ایک تحقیق کے دوران رائن میک کے اور ان کے ساتھیوں نے معلوم کیا کہ جن شرکا کو سزا کا تعین کرتے وقت تحت الشعوری مذہبی ہدایات دی گئی تھیں، انھوں نے دوسروں کے مقابلے پر لوگوں کو غلط کاموں کی زیادہ سخت سزائیں دیں۔ شرکا کو تحت الشعوری طور پر مذہبی سزاؤں، سیکولر سزاؤں اور کنٹرول سزاؤں سے انگیخت (prime) کیا گیا تھا۔ مذہب کی وجہ سے دوسرے دو گروپوں کے مقابلے پر کہیں سخت سزائیں ملیں۔ یہاں دو مکینزم کام کر رہے تھے۔ پہلا ''مافوق الفطرت نگران'' کا میکنزم کہلاتا ہے۔ مذہبی شرکا انگیخت کیے جانے پر

غلط کاموں کی سزا زیادہ سخت دیتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہ کرنے سے مافوق الفطرت نگران برہم یا ناخوش ہوگا۔ دوسرے مکینزم میں ثقافتی اقدار کے منصفانہ پن کے بارے میں مذہبی فعالیت شامل ہے۔

اس طرح دیوتاؤں اور اجداد کی تخلیق کا ٹھوس، اگرچہ غیر شعوری، جواز بنتا ہے۔ اس کا اگلا منطقی قدم اُن نادید قوتوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مذہبی رسومات کی تشکیل تھا۔ لیکن رسومات میں پہلے اگر نادید اور طاقتور ہستیوں کو بلایا جاتا تھا تو ہمارے اجداد کس طرح مخصوص نادید دیوتاؤں پر یقین لے آئے، یا یہ سمجھ بیٹھے کہ مردہ اجداد اب بھی طاقت رکھتے ہیں؟ ہم واپس مذہبی عقیدے کے بنیادی عناصر تک پہنچ گئے ہیں، یعنی خود سے بالاتر طاقت کا تصور، اور اس طاقت سے رابطہ قائم کرنے کا احساس، وغیرہ۔

آج کی طرح اس وقت بھی دیوتا ذہن کی پیداوار تھے، یا اس بات کو زیادہ بہتر طریقے سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ دماغ کے ادراکی مکینزموں کی ذیلی پیداوار تھے۔

رسوم اور وجد میں خوابوں کا کردار

قرینِ قیاس ہے کہ ہمارے اجداد نے دیوتاؤں کو سب سے پہلے خواب میں دیکھا ہوگا۔ آج ہم جانتے ہیں کہ خواب ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ ہماری جذباتی زندگیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتے ہیں، اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان کا کچھ مطلب ہو یا ہوسکتا ہے نہ ہو۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ خواب ''لاشعور کی بادشاہی سڑک ہیں۔''

لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں، ہمارے اجداد کو تجربہ کار ماہرینِ نفسیات کی سہولت دستیاب نہیں تھی، اور ہمارے بہترین ماہرینِ نفسیات بھی یہ نہیں بتا سکتے ہیں کہ ہم خواب کیوں اور کیسے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے اجداد بھی خواب دیکھتے تھے، اور ہمارے پاس یہ سمجھنے کی وجوہات موجود ہیں کہ وہ سمجھتے تھے کہ خواب بہت طاقتور چیز ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں قدیم یونانیوں نے مریضوں کے لیے خصوصی معبد بنا رکھے تھے، جو شفا کے دیوتا اسکلی پیئس (Asclepius) سے منسوب تھے۔ لوگ ان معبدوں

میں سونے کے لیے جاتے تھے اور رسومات، روزوں، اور دعاؤں کے ذریعے خواب دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواب میں دیکھی گئی معلومات کو وہ شفایابی کے لیے استعمال کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دیوتا ان کے خوابوں میں آتے ہیں۔ قدیم مصری بھی خوابوں کو آسمانی علم کا اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔

انسانی ارتقا میں ذرا پیچھے چلے جائیں، اور تصور کریں کہ ایک جنگلی انسان دسیوں ہزار سال قبل افریقہ کے میدانوں میں سویا ہوا ہے۔ اس کے خواب میں ایک مردہ رشتے دار آتا ہے۔ بظاہر اس بات کی کوئی تُک نہیں بنتی۔ لیکن یہ سمجھ لینے کی تُک بنتی ہے کہ خوابوں کا عجیب و غریب ماحول ایک غیر مرئی حقیقت ہے۔ شاید کسی اور دنیا کا حصہ جو عقل مند اور طاقتور اجداد، یا کسی قسم کے دیوتاؤں سے بھری ہوئی ہے جو اس دنیا میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

اب ذرا اس بات کو قدرتی دنیا کے بارے میں حیرت زدگی کے تصور سے ملائیے، ساتھ میں دولخت ادراک شامل کیجیے (جس کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہ نادید چیزوں کو قبول کرنے میں مدد دیتا ہے)، اور دیوتاؤں پر یقین لانے کا نسخہ تیار ہو جائے گا۔

ہمیں کبھی بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہمارے قدیم اجداد نے سب سے پہلے دیوتا کس طرح تخلیق کیے۔ ہوسکتا ہے کہ دیوتاؤں کو قدرتی طاقتوں کی تجسیم کے ذریعے بھی تخلیق کیا گیا ہو، جیسے آگ کا دیوتا۔ آگ اب بھی دنیا کے بیشتر مذاہب کی رسومات میں شامل ہے، جیسے مثال کے طور پر موم بتیوں کی شکل میں۔ ذرا ہمارے اجداد میں سے ایک کا تصور کریں جو پہلی بار آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آگ اسے خاصی معجزانہ چیز لگی ہو گی۔ اس کے علاوہ ڈرامائی موسمی تبدیلیاں، آتش فشاں، سورج، چاند، اور دوسرے عجیب و غریب قدرتی مظاہر بھی اس کے قرب و جوار میں تھے۔ دوسرے طاقتور نفسیاتی مظاہر کی طرح پہلی مافوق الفطرت ہستیوں کے تعین میں کئی اور اجزا بھی شامل تھے۔

دیوتاؤں کے آغاز کے ساتھ شاید خوابوں کے علاوہ بھی ان کے ساتھ رابطہ رکھنے

اوران تک پہنچنے کی خواہش کا بھی آغاز ہوا ہوگا۔ اتفاقی خوابوں پر اکتفا کرنے کی بجائے اگر یونانیوں کی طرح ہمارے اجداد خوابوں کی دنیا کے ساتھ جان بوجھ کر رابطہ کرنا چاہتے تھے، تو انھوں نے خود اپنی ''شاہی سڑک'' تعمیر کی ہوگی۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ انھوں نے گھنٹوں بلکہ دنوں تک رقص اور ڈھول بجانے کے ذریعے وجد کی حالت طاری کرنے کا طریقہ سیکھ لیا ہوگا۔ بعض ریڈ انڈین معاشروں کی طرح انھوں نے بھی اپنے آپ کو الگ تھلگ کر کے حسیات سے محروم کرنے کا طریقہ (sensory deprivation) سیکھا ہوگا، جس سے کسی دوسرے کی موجودگی اور ہر کسی کے ساتھ اتصال کا احساس ہوتا ہے۔

روزے سے نہ صرف احساس متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کے باعث ہذیان بھی طاری ہوسکتا ہے۔ بہت سے مذاہب میں روزہ رکھنے کا چلن ہے۔ شاید اس کی وجہ تصور بڑھانے کا اثر ہو۔ ہمارے اجداد نے یہ رسومات ایک طویل عرصے میں اختیار کیں، اس دوران انھوں نے نیوروٹرانسمیٹرز کی مقدار بڑھانے اور گروہ کی پیوستگی میں اضافہ کرنے کی بایوٹیکنالوجی سیکھ لی۔

قرینِ قیاس ہے کہ ہماری فاعل تلاش کرنے کی صلاحیت کو (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے)، جو تجریدی تصورات کے پیچھے انسانی فاعل کا کردار دیکھتی ہے، رسومات کے دوران دماغی کیمیائی مادوں نے بڑھاوا دیا ہو۔ اس سے ہمارے اجداد کو نہ صرف اپنے مرے ہوئے نادید باپ دادا بلکہ دوسری مافوق الفطرت ہستیوں پر یقین لانے میں مدد ملی ہوگی۔

ہر رسم کا انحصار ایسی سرگرمیوں پر تھا جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ دماغی کیمیا کو متاثر کرسکتی ہیں: موسیقی، گیت، ہم آہنگ حرکات، شدید جذبات، اور ساتھ ہی ساتھ نیند سے محرومی۔ بہت سی رسومات خاصی تھکا دینے والی ہوتی ہیں، اور لوگ ساری ساری رات ناچتے گاتے رہتے ہیں۔ ایسی شدید سرگرمی سے دماغی کیمیائی مادے وافر مقدار میں خارج ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔

ہمارے اجداد نے ممکنہ طور پر یہ معلوم کرلیا تھا کہ رقص (اور بعض نشہ آور اشیا) وجد

کی حالت طاری کر دیتی ہیں، اور رسومات کی مدد سے نادید ہستیوں تک براہِ راست رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ رسومات ایک خارجی دنیا کے وجود اور اس کے اندر موجود روحوں کا عوامی ثبوت بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال انگریزی لفظ enthusiasm ہے، جس کا مادہ یونانی لفظ enthousiasmos ہے، جس کا مطلب ہے ''جس کے اندر دیوتا حلول کر گئے ہوں۔''

رسومات کے دوران گروہ پر توجہ مرکوز کریں، نہ کہ فرد پر، اور اس طرح رسوم سے گروہ کی بقا کے بارے میں اہم ضوابط اور سبق ملیں گے۔ رسومات وہ کرتی ہیں جو فرد نہیں کر سکتا: یہ قبیلے کے گمراہ لوگوں کے لیے ایک پرخطر نادید دنیا، خاص طور پر مردہ اجداد کی دنیا کو سامنے لاسکتی ہیں۔

یہ ابتدائی رسومات عام طور پر زندگی کے مختلف مراحل، مثلاً پیدائش، بلوغت، شادی اور موت پر ادا کی جاتی تھیں۔ ماہرِ بشریات راڈنی نیڈہیم نے بتایا ہے کہ موجودہ دور کے باقی ماندہ وحشی معاشروں میں زندگی کے مراحل کے لیے ضرب مار کر بجائے جانے والے ساز اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کی رسومات کے لیے ضرب والے ساز آج بھی ہر معاشرے میں بجائے جاتے ہیں۔ اس کی باقیات کالج کی تنظیموں میں اب بھی پائی جاتی ہیں جہاں نئے آنے والے طلبہ کو خوفناک اور دردناک، اور بعض اوقات مہلک طریقوں سے کالج کی زندگی سے روشناس کروایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ موش پٹ (ایک قسم کا بے حد جارحانہ رقص) بھی رسومیاتی جوش وخروش سے ملتا جلتا ہے۔

آج کے بچے کھچے تینوں وحشی قبائل جو ہمیں قدیم ماضی میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں، لوگوں کو اپنے قبیلوں کے رازوں میں شریک کرنے کے لیے رسوم استعمال کرتے ہیں۔ روشناسی رسوم (initiation rituals) دردناک اور خوفناک ہوسکتی ہیں اور یہ ایسے دماغی کیمیائی مادے خارج کرتی ہیں جو قبیلے کے ساتھ ربط کو مضبوط بناتے ہیں۔ اس قسم کی رسومات مردوں کو جنگوں کے لیے آمادہ کرتی ہیں، انھیں وفادار بناتی ہیں، اور قبیلے

کے رسم ورواج کے ساتھ وابستگی مضبوط کرتی ہیں۔

آسٹریلیا کے آبائی باشندے (ایبورجنی) قبل از تاریخ وقت کو ''خواب وقت'' (Dreamtime) کہتے ہیں جب دیومالائی ہستیاں آس پاس گھومتی پھرتی، آپس میں لڑتی اور دنیا تخلیق کرتی تھیں۔ آج بھی بعض مخصوص رسومات کو باہر کے لوگوں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے، تاکہ قبیلے کا مضبوط رشتہ برقرار رہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایبورجنی تقریبات لمبی ہوتی ہیں اور عام طور پر ان میں خواب وقت کے اساطیر گائے جاتے ہیں، مقدس تصورات پر غور و فکر کیا جاتا ہے، اور نئے شامل ہونے والوں کو دیومالا اور دوسری اشیا سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ ان رسوم میں رقص اور ٹوٹمی جانوروں کی نقالی شامل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تالیاں بجانا، چھڑیوں اور پتھروں کو آپس میں ٹکرانا، اور بعض جگہوں پر لمبے نلکی نما ساز بجانا شامل ہوتے ہیں۔

رسومات بطور بقا کا مکینزم

ہمارے اجداد کی مذہبی رسومات بیک وقت کئی مسائل حل کرتی تھیں۔ قبیلہ غلط کاروں کو سزا دے سکتا تھا، تنازعات اور جھگڑوں کا حل ڈھونڈ سکتا تھا، کاہلوں کی نشان دہی کر سکتا تھا، گلے شکوے دور کر سکتا تھا، اور ایک ایسا اکھاڑا تشکیل دے سکتا تھا جس کی نقل مشکل ہوتی، اور جہاں مخلصانہ اشارے قبول کیے جاتے۔ اس کے علاوہ رسومات کی وجہ سے شکاری جانور بھی ڈر کر بھاگ جاتے ہوں گے۔

ان ابتدائی مذاہب میں غالباً کوئی مذہبی پیشوا یا مذہبی درجات نہیں ہوتے ہوں گے۔ ان میں بہت سے سرکردہ مرد اور عمائدین ہوتے ہوں گے جن کے پاس نیم سربراہانہ قسم کی عہدے ہوں گے، جو بعد میں شامان کے عہدے میں تبدیل ہو گئے۔ البتہ وہ آج کل کے مذہبی پیشواؤں کی طرح کے غیر مرئی دنیا کے پیغام رساں نہیں ہوتے ہوں گے۔

نکولس ویڈا اپنی کتاب مذہبی جبلّت (The Faith Instinct) میں لکھتے ہیں کہ رسومات اپنائیت کا زبردست احساس پیدا کرتی تھیں، اور یہ خواہش بیدار کرتی تھیں کہ

قبیلے کے مفادات کو ذاتی مفادات سے بلند تر رکھا جائے۔ جب ہم ساری ساری رات کسی کے ساتھ مل کر ناچتے گاتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو اس کے ساتھ ایک مضبوط بندھن میں بندھا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

آثارِ قدیمہ اور علمِ بشریات کا ریکارڈ اس نظریے کو تقویت پہنچاتا ہے کہ ہمارے وحشی اجداد جہاں جہاں جاتے تھے، اپنی یہ رسومات ساتھ لے کر جاتے تھے۔ یہ سفری، دیرپا رسومات رقص ونغمہ اور وجد کے گرد گھومتی رہیں۔

ابتدائی بستیوں کا آغاز آج سے پندرہ ہزار سال پہلے ہوا۔ دس ہزار سال قبل زراعت ایجاد کر لی گئی۔ اگرچہ آج دنیا میں بہت کم شکاری اور جمع کرنے والے (hunter-gatherer) قبیلے باقی بچے ہیں، انھی کے قائم کردہ مذاہب اتنے طاقتور تھے کہ انھیں ترک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم بدلے تو ساتھ میں مذہب بھی بدل گیا۔

انسان زراعت پیشہ ہو گیا۔ مذہب نے موسموں کا آہنگ اختیار کر لیا کیوں کہ موسم زراعت کے لیے اہم تھے۔ یہ روایت آج بھی زندہ ہے۔ پرانے مذاہب نے بہار کا تہوار منانا شروع کیا، جسے اوئسٹرا (Oestra) کہا جاتا تھا۔ یہودیت میں سکوتھ منایا جاتا ہے جو فصل کی کٹائی کا تہوار ہے۔ پاس اوور جو کا جشن ہے۔ شاوواوت گندم کا موسم ختم ہونے کا تہوار ہے۔ عیسائیت نے ان تہواروں کو ایسٹر اور دوسرے تہواروں کی شکل میں اختیار کر لیا۔

پانچ ہزار سال قبل تحریر کے چلن کے بعد مافوق الفطرت تک رسائی ایک جمہوری عمل نہ رہا۔ مذہبی پیشواؤں نے سیاسی قوتوں کے ساتھ مل کر قدغنیں لگانا شروع کر دیں۔ مذہبی پیشواؤں اور شامانوں نے سیکھ لیا کہ ان کے پاس طاقت بغیر ذمے داری کے تھی، یعنی وہ ناکامی کا ذمے دار دیوتاؤں کو یہ کہہ کر قرار دے سکتے تھے کہ وہ تو صرف پیام بر ہیں۔

رقص ونغمہ اور وجد کی سب سے پہلی رسومات سماجی طور پر مساویانہ ہوا کرتی تھیں، جس میں تمام قبیلہ اکٹھے شرکت کیا کرتا تھا اور ہر قسم کی درجہ بندی ختم ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن

شہروں اور تہذیب کے قیام کے بعد زیادہ طبقہ بندی شروع ہوگئی۔ بعض مذاہب میں رقص پر پابندی لگا دی گئی کیوں کہ اس کی وجہ سے سماجی مساوات کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ البتہ ہم آہنگ حرکات جاری رہیں۔ اس کی ایک مثال اسلام میں پائی جاتی ہے جہاں لوگ نماز کے دوران اکٹھے ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، جھکتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا فرشی رقص ہے۔

یا کسی رومن کیتھولک چرچ میں جا کر قربان گاہ کے سامنے جھکنے، اور عشائے ربانی کے سامنے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کا منظر دیکھیے۔ یا پھر 1960ء کی دہائی تک گریگورین چرچ کی لاطینی رسومات کے دوران گنگنا کر گیت گانے (chant) کے کردار پر غور کیجیے۔ روایتی افریقی امریکی چرچوں میں گاسپل موسیقی کی طاقت کا جائزہ لیجیے، جس کی جڑیں افریقی رقص اور رسومات میں ہیں۔

ہم دوسرے مذاہب میں رسومات کی طاقت بنیادی طور پر اس لیے دیکھتے ہیں کہ اس سے خوف کھایا جاتا ہے۔ بعض جنوبی اصطباغی (Southern Baptists) کھڑے ہو کے جنسی عمل نہیں کرتے تاکہ کہیں خدا یہ نہ سمجھے کہ وہ رقص کر رہے ہیں۔ گرجا گاہوں کے اندر واقع بنچ اس لیے نہیں بنائی جاتی تھیں کہ لوگ ان پر بیٹھیں۔ یورپی چرچوں میں بنچیں بنانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ناچنے سے روکا جا سکے۔ لیکن بعض زیادہ جذباتی قسم کے اجتماعوں میں بنچیں بھی لوگوں کو ناچنے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔

ہمارے اجداد کے لیے گانا، ناچنا، موسیقی اور حرکت سب ایک تھے۔

موسیقی کے آغاز کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ کیا یہ دوسرے مکینزموں کی ذیلی پیداوار ہے، جس کی بنیاد دل کی دھڑکن کے آہنگ پر رکھی گئی؟ یا پھر موسیقی خودمختار مطابقت ہے؟ ڈارون کا خیال تھا کہ موسیقی ان کے جنسی چناؤ کے نظریے کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے۔

''میں اس پر بات ختم کرتا ہوں کہ انسان کے آبا نے موسیقی کے تال اور آہنگ کو

پہلے پہل صنفِ مخالف کی توجہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ موسیقی کی تانیں ان تند و تیز ترین جذبات سے منسوب کی گئیں جو کوئی جانور محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' ڈارون نے لکھا کہ موسیقی سے بیدار ہونے والے کئی جذبات کا تعلّق محبّت سے ہے۔

اس سے ابتدائی مذہبی رسومات کے ایک اور پہلو کی طرف دھیان جاتا ہے۔ انھیں ہفتے کی رات چوک میں رقص کا ذرا پرانا روپ سمجھیے، وہ جگہ جہاں ممکنہ شریکِ حیات سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ آپ کے پسندیدہ فرد کی طاقت، ہم آہنگی، کردار اور قبیلے کے ساتھ وفاداری جانچنے کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا ہے؟ ناچ، گانے اور وجد میں کھوکھلا پن نہیں چلتا، اور یہ شریکِ حیات کی قدر معلوم کرنے کا عمدہ پیمانہ ہیں۔

احتیاط

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کیتھولک ایتھلیٹ دوڑ شروع ہونے سے قبل اپنے سینے پر کراس کا نشان بناتا ہے۔ یہ دیوتا سے مدد کی درخواست اور بے چینی کم کرنے کا طریقہ ہے۔ باسکٹ بال کے مشہور کھلاڑی لیبرون جیمز ہر میچ شروع ہونے سے پہلے ایک رسم ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں پر ٹالکم پاؤڈر چھڑکتے ہیں، تالی بجاتے ہیں جس سے ہر طرف پاؤڈر بکھر جاتا ہے۔ پھر وہ بقیہ پاؤڈر کو اپنے مداحوں کی طرف ہوا میں اچھال دیتے ہیں۔ اس سے ان کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے اور بے چینی کم ہوتی ہے۔ اس قسم کی تکراری حرکات خوف دور کرنے کا کام کرتی ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ کا خیال تھا کہ مذہب معاشرے کی اضطراری بیماری (disorderobsessive-compulsive) ہے، اور یہ کہ یہی بیماری نجی مذہب ہے۔ ڈارون نے ربط ڈھونڈ لیا تھا لیکن ان کے پاس وہ آلات نہیں تھے جن کی مدد سے وہ اسے پورے طور پر سمجھ سکتے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے اندر پیش بندانہ نگہبانی کے نظام موجود ہیں جو بے چینی ختم کرنے کے لیے تکراری افعال سرانجام دینے لگتے ہیں۔ یہ مکینزم مذہبی رسومات میں استعمال ہوکر بے یقینی یا خطرے سے پیدا ہونے والی بے چینی کو کم کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں زندگی کا لازمہ ہیں لیکن ہمارے اجداد کے دور کی

خطرناک دنیا میں یہ اور بھی زیادہ اہم ہوں گی۔

ہم آہنگی اور اتصال

مذہبی رسومات ہمارے مرر نیورانز (آئینہ دماغی خلیوں) کو استعمال کرتی ہیں، جن کا تفصیلی ذکر نویں باب میں آئے گا۔ ان مرر نیورانز کا اصل مقصد شاید کسی جاندار کو نئی چیزیں سیکھنے میں مدد دینا تھا۔ مذہبی رسومات اس کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ جب بہت سے لوگ آپ کے اردگرد ناچ رہے ہوں تو ناچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مرر نیورانز ہم آہنگی کی وجہ سے ایسا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ سٹینفرڈ بزنس سکول میں کی جانے والی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ بھاری پٹھوں کے استعمال کے بغیر ہم آہنگ حرکات سے تعاون کے احساس میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ اگر چہل قدمی کر رہے ہوں یا دوسروں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہوں، دونوں صورتِ حال میں آپ کی اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچ مختلف ہوتی ہے۔

اس میں بھاری پٹھوں کا عمل بھی شامل دیں تو سونے پر سہاگہ والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم آہنگ حرکات میں بھاری پٹھوں کا عمل شامل ہو جائے تو درد سہنے کی برداشت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آکسفرڈ یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے ایک دلچسپ تجربے میں کشتی رانوں کا اکیلے اور اکٹھے کشتی چلانے کا مشاہدہ کیا۔ تجربے میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی تھی کہ کشتی ران کس قدر مشقّت کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اکیلے کشتی ران کی درد برداشت کرنے کی صلاحیت مل کر کشتی چلانے والوں کے مقابلے پر کم ہوتی ہے۔ گروپ کی سرگرمی کے دوران انڈورفنز کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انڈورفنز سماجی بندھنوں کو مستحکم کرتی ہیں۔

ذرا اوڈسٹاک واقعے کے بارے میں سوچیے، جو نہ صرف ان لوگوں کے لیے جو وہاں موجود تھے بلکہ پوری ایک نسل کے لیے انتہائی اہم موقع تھا۔ یہ واقعہ عدم تشدد اور کسی تنازعے کے نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔ اس دوران بہت سے لوگ سخت حالات میں اکٹھے کام کرتے تھے، اور موسیقی، رقص، جنس، بھائی چارے، اور منشیات سے لطف اندوز

ہوتے تھے۔

یہ چیزیں دماغی کیمیائی مادوں کو مزید تقویت دیتی ہوں گی اور ماحول اور ہم آہنگی کے اثر کی وجہ سے انھیں مزید ہوا ملی ہوگی۔

رسومات کی باہمی گرفت کی طاقت ہم ہائی سکول کی پیپ ریلی میں بھی دیکھ سکتے ہیں، جس کا مقصد طلبہ کو مخالفین کے مقابلے پر متحد کرنا ہوتا ہے۔

لمس کی جادوئی طاقت

بندر ایک دوسرے کی دیکھ بھال میں بہت وقت صرف کرتے ہیں۔ شاید اس کی اصل وجہ صحت اور جوئیں مارنے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ لمس سے آکسیٹوسین خارج ہوتی ہے جس سے سماجی وابستگی کے جذبے کا آغاز ہوتا ہے۔ انڈورفنز اس کو مزید مضبوط بناتی ہیں۔ اگر آپ کسی عورت کو ایک ایسی خطرناک صورتِ حال دکھائیں جب وہ کسی کا ہاتھ تھامے ہوئے نہ ہو تو اس کے دماغ کا امیگڈیلا نامی حصہ روشن ہو جائے گا۔ یہ حصہ خوف کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ خوف زدہ ہے۔ اگر وہ کسی اجنبی کا ہاتھ پکڑے تو اس کا خوف کسی حد تک کم ہو جائے گا۔ اگر وہ اپنے شریکِ حیات کا ہاتھ تھامے تو خوف اور بھی زیادہ کم ہو جاتا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عورت کے خوف میں کمی اس کے اپنے ساتھی کے ساتھ تعلّقات کے تناسب سے ہوتی ہے۔ اچھے تعلّقات سے خوف میں زیادہ کمی آتی ہے۔

لمس سے دماغ کے جذباتی مراکز سکون میں آجاتے ہیں اور اس طرح ہمیں مسئلے کو حل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دماغ لمس کو اس اشارے کے طور پر لیتا ہے کہ دوسرا شخص بوجھ اٹھانے میں مدد دے گا۔

انسان پرائمیٹ جانوروں میں سب سے زیادہ تعاون کرنے والی نوع ہیں، اور لمس سے ہمارے حلیفوں کے دماغوں میں مل جل کر کام کرنے کے تعلّقات مزید گہرے ہوتے ہیں۔ ایک اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ باسکٹ بال کی وہ ٹیمیں جس کے کھلاڑی ایک دوسرے کو زیادہ چھوتے ہیں، زیادہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب شاٹ کے بعد

ہاتھ پر ہاتھ مارنے، کمر پر تھپکی دینے، اور گلے ملنے سے نیوروٹرانسمیٹرز کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے، جو باہمی تعاون، یک جہتی، اور گروہ کے اتصال کے احساس کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

ایک زمانے میں ہمارے اجداد نے غیر شعوری طور پر وہ کیمیا دریافت کر لی تھی جو اعتماد، محبّت، تعاون، اور ایثار کو تقویت دیتی تھی۔ اس کے بعد سے ہم نے مسلسل ترقی کی ہے۔ یہ بے حد طاقتور کیمیائی تعاملات ادراکی مکینزموں کو توانائی سے معمور کر دیتے ہیں جن سے مافوق الفطرت عقائد پنپتے ہیں۔ یوں مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔

ایک چھوٹا سا تجربہ

ایک لمحے کے لیے کسی کے بارے میں سوچیں جس سے آپ محبّت کرتے ہیں، اور اس فرد کے لیے اپنے جذبات پر غور کریں۔ اب اس لمحے اپنی جذباتی حالت کا تجزیہ کریں۔ پھر اپنے بازو پر زور سے چٹکی لیں جس سے درد ہونے لگے۔ جب آپ نے یہ تینوں پیمائشیں کر لیں تو اُٹھ کھڑے ہوں اور جھومتے ہوئے ایک گیت گائیں۔ اگر آپ کے قریب کوئی اور موجود ہے تو اس کے گرد باہیں حمائل کر دیں اور دونوں ناچ گانا شروع کر دیں۔ جب آپ گانا ختم کر لیں تو دوبارہ پیمائش لیں۔ اب دیکھیں کہ آپ کے درد کو برداشت کرنے کی صلاحیت کتنی ہے۔ آپ اس فرد کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں؟ آپ اپنے بارے میں کیا محسوس کر رہے ہیں؟

(اپنے اس پڑوسی کو نظر انداز کر دیں جو آپ کو کھڑکی میں سے یہ سب حرکتیں کرتے دیکھ رہا ہے۔)

جب میں لوگوں سے یہ کرواتا ہوں تو تقریباً ہر ایک مثبت تبدیلی رپورٹ کرتا ہے۔ ان چھوٹی سی مشق میں آپ کو دماغ کے اندر نیوروکیمیکل تبدیلیوں کے بارے میں پتا چلتا ہے جو گیت، لمس، اور ہم آہنگ حرکت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ صرف چند لمحوں کے اندر اندر ہو جاتا ہے۔ ذرا تصور کریں کہ اگر آپ افریقہ کے میدانوں میں یا آسٹریلیا کے دشتوں میں یہ کام ساری ساری رات کر رہے ہوں!

اگر آپ کبھی کسی راک کنسرٹ میں گئے ہوں، جہاں مداح ناچتے گاتے اور لہراتے ہیں، اور آپ نے اپنی رگوں کے اندر سنسنی محسوس کی ہو تو آپ نے رسومات کی طاقت کی مشاہدہ کیا ہے۔

رسومات شریکِ حیات کی اہلیت جانچنے کا پیمانہ بھی ہوتے ہیں، اور یہ بات ہماری انسانیت کا ایک اور پہلو ہے جسے مذہب استعمال کرتا ہے۔

رومانوی محبّت

ہمارے رومانوی تعلّقات دماغ میں مخصوص مطابقتوں کے باعث پروان چڑھتے ہیں۔ جنسی خواہش اس کا آغاز فراہم کرتی ہے اور رومانوی محبّت کسی ایک شخص کے ساتھ مضبوط وابستگی پیدا کرتی ہے۔ مذہب اس چیز سے استفادہ کرتے ہوئے رومانی تعلّق تخلیق کرتا ہے۔ مسلمان شہدا سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ انھیں جنت میں حوریں ملیں گی۔ حماس کے مذہبی رہنما شیخ یاسین نے کہا تھا کہ عورتوں، خاص طور پر کنواری عورتوں کے لیے خودکش حملہ آور بننا ٹھیک ہے، کیوں کہ وہ جنت میں جا کر حوروں سے زیادہ حسین بن جائیں گی۔

انھیں ضمانت دی جاتی ہے کہ جنت میں انھیں خالص شوہر نصیب ہوگا۔ مرد خودکش حملہ آوروں کو بہتّر حوروں کا وعدہ شاید محبّت سے زیادہ ہوس کا مظہر ہے، جو مردوں کی جنسی خواہش سے استفادہ کرتی ہے۔

دوسرے مذاہب میں بھی رومانوی محبّت کی اہلیت کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مدر ٹیریسا کی مثال لیں۔ ان کے حال ہی میں شائع ہونے والے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ عیسیٰ سے شادی کرنے کی بات کرتی ہیں۔ درحقیقت قرونِ وسطیٰ میں ننوں کی چرچ میں شمولیت کی تقریب شادی کی طرح منائی جاتی تھی، اور چرچ کو جہیز بھی دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ آج بھی ننوں کے بہت سے فرقے اپنے آپ کو ''عیسیٰ کی دُلہنیں'' کہلاتے ہیں، اور ابتدائی رسومات کے موقعے پر شادی کے لباس پہنے جاتے ہیں اور شادی کی انگوٹھیاں دی اور لی جاتی ہیں۔

ٹی وی پر ایک شو God of Letting Go کے دوران ایک مزاحیہ فن کار جولیا سوینی انکشاف کرتی ہیں کہ جوانی کے زمانے میں جنسی خواہشات میں تخفیف کے لیے عیسیٰ کی ایک تصویر ان کی بڑی مدد کیا کرتی تھی۔

باب سوم میں مذکور وابستگی کا نظام رومانوی تعلّقات میں بھرپور طریقے سے حصہ لیتا ہے۔ ہم خواہش سے شدید رومانوی فریفتگی، اور پھر جذباتی محبّت کا سفر کرتے ہیں، جو وابستگی کے نظام کا آخری مرحلہ ہے۔

والدانہ سرمایہ کاری

اصناف کے درمیان بنیادی فرق صرف جین ہی متعیّن نہیں کرتے۔ اس فرق کا تعین ایک مخصوص رویے سے ہوتا ہے جسے والدانہ سرمایہ کاری (Parental Investment) کہا جاتا ہے۔ اس کا تعلّق اس بات سے ہے کہ کس صنف کا بچے سے زیادہ نفسیاتی لگاؤ اور جذباتی سرمایہ کاری ہے۔

زیادہ تر انواع میں مادہ اولاد پر زیادہ سرمایہ کاری کرتی ہے۔ مثال کے طور پر انسانوں میں عورت غذائیت سے بھرپور بیضہ تیار کرتی ہے، جس کے لیے اس کا رحم اس کی تولیدی زندگی کے ہر ماہ تیاری کرتا ہے۔ پھر وہ بچے کو نو ماہ کوکھ میں رکھتی ہے، پھر زچگی کے ممکنہ مہلک عمل سے گزرتی ہے، اور بچے کو برسوں دودھ پلاتی رہتی ہے۔ ماں بچے کی انتہائی زیادہ قیمت چکاتی ہے۔ اس کے مقابلے پر مردوں میں اس کی قیمت چند سپرم اور پانچ منٹ ہیں۔

مرد اور عورت کے درمیان بچے پر سرمایہ کاری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بچے کے پیدا ہونے کے بعد مغرب کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی اس کی دیکھ بھال کی ذمے داری عورت پر پڑتی ہے۔ باپ کبھی کبھی بچے کے پوتڑے صاف کرتا ہے، اور بس، لیکن یہ زیادہ تر عورت کی ذمے داری ہے۔

اس لیے رویے کی حد تک وہ صنف جس کی سب سے زیادہ سرمایہ کاری ہوتی ہے، وہ اس بات کا انتخاب کرتی ہے کہ وہ کس کے ساتھ ملاپ کرے۔ عام طور پر یہ صنف مادہ

ہوتی ہے۔تولید کے میدان میں مادہ کی مرضی چلتی ہے۔وہ صنف جس کی بچوں کے معاملے میں سب سے کم سرمایہ کاری ہوتی ہے، جو عام طور پر نر ہوتا ہے، اسے اپنے جینیاتی مادے کی بقا کے لیے اپنی صنف کے دوسرے ارکان کے ساتھ مادہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

انسانوں میں حیاتیات کی طرف سے عورتوں کو دی گئی اہمیت اور انتخاب کی طاقت مردوں کے لیے سبکی کا باعث بنی ہے، جس کی وجہ سے وہ مسلسل ایسے ہتھکنڈے ڈھونڈتے رہتے ہیں جن کے ذریعے عورت کی تولید پر تسلّط قائم کر سکیں۔ایسے ہتھکنڈوں میں کثیر الازدواجی، عورتوں کو سر پیر تک برقع اوڑھانا، اور وحشیانہ طریقے، مثلاً عورتوں کے ختنے کروانا وغیرہ شامل ہیں۔بعض مذہبی یا فرقے وارانہ جنگوں میں مرد اپنے حریف پر فتح پانے کے بعد ان کی عورتوں کو دشمن کی آنکھوں کے سامنے جنسی زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں۔

اس بات کو عورتوں کے مقابلے پر مردوں کی زیادہ بڑی سبکی سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ اس کے بعد عورتوں کے ماتھے پر اپنے قبیلے میں بھی ساری عمر کے لیے کلنک کا ٹیکا لگ جاتا ہے۔یہی داغ بچے کے نصیب میں بھی لکھا ہوتا ہے۔

یک زوجی معاشروں میں بھی، جہاں دونوں اصناف میں موزوں رشتہ ڈھونڈنے کے لیے زیادہ مقابلہ ہوتا ہے، مذہب اہم پہلو ہوتا ہے۔ذرا روایتی عیسائی شادی کی تقریب پر غور کیجیے: ''جس کو خدا نے جوڑا ہے، اسے کسی انسان کو نہ توڑنے دیں۔''

دو ہزار نو میں ایری زونا کالج کے طلبہ پر کی جانے والی تحقیق سے انکشاف ہوا کہ مردوں اور عورتوں دونوں کو جب ان کی اپنی صنف کے پرکشش افراد کی تصاویر دکھائی گئیں تو ان کی مذہبی احساسات میں اضافہ ہو گیا۔واضح رہے کہ اپنی صنف کی تصاویر، نہ کہ صنفِ مخالف کی۔اس لیے جب ممکنہ شریکِ حیات کے لیے مقابلہ ہوتا ہے تو مذہب بھی میدان میں آجاتا ہے۔

بہت سے مذاہب جنس پر بہت زیادہ تکیہ کرتے ہیں، اور یہی اس بات کی دلیل

ہے کہ مذاہب خود انسان نے تخلیق کیے ہیں۔

یہاں تک ہم نے عقیدے اور رسومات کے بنیادی اجزا کا ذکر کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ یہ کس طرح مطابقتی ادراکی مکینزموں کی ذیلی پیداوار ہیں۔ لیکن اب ہمارے پاس دماغ کی تصاویر سے حاصل ہونے والے شواہد بھی موجود ہیں۔ آئیے اب دیکھتے ہیں کہ دماغ کے اندر جھانکنے سے کیا نظر آتا ہے۔

اے ایمان والو

ذیلی پیداوار کے طور پر خدا کا جسمانی ثبوت

''اس وقت مستقبل حال کے لیے کتنا اہم ہوتا ہے جب انسان بچوں
کے درمیان گھرا ہو۔'' (چارلز ڈارون)

لفظ ذیلی پیداوار خاصا غیر اہم لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی کمزور یا بے وقعت سی چیز ہو، لیکن اصل میں بات اس کے الٹ ہے۔ مثال کے طور پر لکھنا اور پڑھنا ان مطابقتوں کی ذیلی پیداوار ہیں جو کسی اور مقصد کے لیے تخلیق کی گئی تھیں۔ ہمارے دماغ میں پڑھنے لکھنے کے عضو موجود نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے پاس دوسری مطابقتوں کے علاوہ بینائی، زبان، علامتی سوچ، اور ہاتھوں کی خفیف حرکات کے لیے پٹھے موجود ہیں۔ یہ تمام مطابقتیں اس وقت اکٹھّے حرکت میں آئیں جب انسان نے لکھنا اور پڑھنا سیکھا۔ یہ ہماری نوع کے سب سے اہم ثقافتی ایجاد تھی۔

اسی طرح موسیقی بھی ممکنہ طور پر زبان کی ذیلی پیداوار ہے، کیوں کہ اس میں مصوتوں اور مصمتوں کو آہنگ میں لایا جاتا ہے اور تال بنیادی طور پر دل کی دھڑکن سے لی گئی ہے۔

کسی ثقافتی پیداوار کی اثر پذیری کی طاقت دیکھنی ہو تو اپنا کوئی پسندیدہ گیت سنیں، خاص طور پر ایسا جس کے ساتھ کچھ یادیں وابستہ ہوں۔

مذہب ایک طاقتور قوت ہے جس نے تاریخ کے دھارے اور انفرادی رویوں کا رخ متعیّن کیا ہے۔ اسے ذیلی پیداوار کہنے سے اس کی طاقت کم نہیں ہو جاتی، خاص طور پر اس صورت میں کہ حالیہ تحقیقاتی مطالعے اس طاقت کو مزید ظاہر کرتے ہیں۔ حال میں کیے جانے والی تحقیق سے ہمارے اوپر مذہب کی مافوق الفطرت گرفت کے بارے میں عملی اور چشم کشا شواہد سامنے آئے ہیں۔

ڈنمارک کے نیوروبائیولوجسٹ اور صحافی لون فرینک کہتے ہیں ''تقدیس ہمارے دو کانوں کے درمیان واقع ہے۔'' نیورسائنس اور دماغی تصاویر سے یہی بات کھل کر سامنے آتی ہے۔

دماغی تحقیق اور مذہب کی دنیا کا غالباً سب سے مشہور نام مائیکل پرسنگر کا ہے، جو کینیڈا کی لورینشن یونیورسٹی کے نفسیات دان ہیں۔ وہ 1980ء سے ''خدائی ہیلمٹ'' کی مدد سے تجربات کر رہے ہیں۔ لوگوں کو ایک تاریک اور خاموش کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے، ان کے دیکھنے اور سننے کی صلاحیت معطّل کر دی جاتی ہے، اور ان کے سر پر ایک ہیلمٹ رکھ دیا جاتا ہے جو ان کے دماغ کے جانبی حصے (temporal lobe) کو مقناطیسیت کے ذریعے انگیخت کرتا ہے۔

تجربے میں شامل افراد ''کسی دوسرے'' کی موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے ذاتی اور ثقافتی پس منظر کے مطابق یہ افراد اس ''موجودگی'' کو کسی مافوق الفطرت ہستی یا کسی مذہبی شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عورتوں میں یہ تجربہ مردوں سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

پرسنگر کا کہنا ہے کہ ہمارے اندر کوئی مستقل اور واحد ذاتی احساس نہیں ہے، اور نہ ہی ہمیں دماغ کا کوئی ایسا حصہ ہے جہاں سے یہ احساس پھوٹتا ہو۔ درحقیقت دماغ کے اندر کئی ایسے حصے ہیں جو ہماری ذات کا شعوری احساس تخلیق کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ جاگتے

وقت دماغ کا بایاں حصہ غالب رہتا ہے جو زبان کو کنٹرول کرتا ہے۔ خوف، ڈیپریشن، ذاتی صدمے، کم آکسیجن، خون میں کم شوگر کی کم مقدار، یا ''خدائی ہیلمٹ'' پہننے سے ایک اضافی ذاتی احساس ہمارے لاشعور میں در آتا ہے، جو ''دوسرے'' کے شکل میں آشکار ہوتا ہے۔

ٹیمپورل لوبز کے ذریعے مذہبی تجربے کے احساس کی انگیخت صرف کسی تجربہ گاہ کے اندر ہونے والا نصابی عجوبہ نہیں ہے۔ ٹیمپورل لوبز نہ صرف بولنے بلکہ خدا کی آواز سننے کے مذہبی احساس میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ہم اپنے اندر کی آواز کو غلطی سے کسی اور کی آواز سمجھ سکتے ہیں۔ کئی برسوں سے اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ٹیمپورل لوب کی مرگی کے شکار افراد کو بہت شدید مذہبی احساس ہوتا ہے، اور ایسے مریض کٹر مذہبی ہوتے ہیں۔

سینٹ پال جب دمشق جا رہے تھے تو ممکن ہے انھیں سڑک پر مرگی کا دورہ پڑا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب کے بانی مرگی کے مریض ہیں۔ سینٹ ٹیریسا آف ایویلا، فیودور دوستویفسکی، اور مارسل پروست وغیرہ کو ٹیمپورل لوب کی مرگی تھی، جس سے ان کی توجہ مذہب پر مرکوز ہوئی۔

امریکہ کی ٹامس جیفرسن یونیورسٹی کے ڈاکٹر اینڈریو نیوبرگ نے ننوں کے دماغ کی دعا کرتے ہوئے، راہبوں کی مراقبے کے دوران، اور دوسرے افراد کی وجد کے مختلف حالتوں میں تصاویر لی ہیں۔ ان کے کام سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی فرد کی ایسی جذباتی حالت جس میں وہ اپنے آپ کو ''کائنات کے ساتھ ہم آہنگ'' محسوس کرتا ہے، کا تعلّق دماغ کے فرنٹل لوب کی زیادہ فعالیت اور بائیں پیرائٹل لوب کی کم فعالیت سے ہوتا ہے۔ دماغ کے یہ حصے ایسی معلومات کو مجتمع کرتے ہیں جو ہمیں اپنے ماحول کے اندر اپنا تعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ حصے ہمیں بتاتے ہیں کہ ہمارا جسم کہاں ختم ہوتا ہے اور باقی دنیا کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

اگر پرجوش دعاؤں، مراقبے، زیرِ لب تلاوت، مذہبی موسیقی، سرگوشیوں میں مناجات پڑھنے، اور دوسری تکنیکوں سے دماغ کے اس حصے کو حسیاتی ترسیل روک دی جائے تو دماغ کو خود اور غیر، اندرونی اور بیرونی دنیا کے درمیان فرق کرنے سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

جب دماغ کے اس حصے کو بیرونی دنیا سے حسیاتی معلومات نہیں ملیں گی تو فرد اپنے آپ کو کل کا حصہ محسوس کرنے لگے گا۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اس قسم کی تحقیق میں مستثنیات ہوتی ہیں، جیسے ہیلمٹ پہنے ہوئے لوگ، ننیں، خمیسی، مرگی کے مریض، مجذوب، وغیرہ۔ مثال کے طور پر خمیسی اور کرشماتی عیسائی جب خودکار طریقے سے بولتے ہیں (glossolalia) تو اس کا الٹ واقع ہوتا ہے۔ اس موقعے پر فرنٹل لوب میں کم فعالیت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے کنٹرول ختم ہونے کا احساس ہوتا ہے، جس سے اپنی ذات اور خدا کے درمیان تعلّق کا تجربہ ہوتا ہے۔

سنہ 2009ء میں امریکہ کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کے زیر اہتمام ایک کتاب شائع ہوئی جس کے مصنّف دمتریوس کیپوجیانس اور پانچ دوسرے محققین تھے۔ اس کتاب کا نام تھا ''مذہبی عقیدے کی ادراکی اور نیوریاتی اساس'' (The Cognitive and Neural Foundations of Religious Belief) اور اس میں مذہب کے ذیلی پیداوار ہونے کے زبردست شواہد دیے گئے تھے۔

اس تحقیق میں لوگوں کے دماغوں کا فنکشنل ایم آر آئی کے ذریعے تجزیہ کیا گیا۔ تحقیق کاروں نے ان لوگوں کے سامنے مذہب کے بارے میں کئی بیانات پڑھ کر سنائے اور ان سے کہا گیا کہ وہ اس سے اتفاق یا اختلاف کریں۔ اگرچہ دماغ کے اندر کوئی ''خدائی مرکز'' نہیں پایا گیا، لیکن نیوروامیجنگ کے ذریعے معلوم ہوا کہ دماغ کے مذہبی نیٹ ورکس وہی ہیں جو ذہن کے نظریے، نیت، اور جذبات میں استعمال ہوتے ہیں۔

مذہبی اور غیر مذہبی افراد کے نتائج کے تقابل سے بیانات کا تجزیہ کرنے کے طریقۂ کار میں کوئی فرق نہیں پایا گیا۔ مذہبیت کوئی الگ عمل نہیں ہے، یہ انھی دماغی نیٹ ورکس کے ساتھ منسلک ہے جو سماجی ادراک میں استعمال ہوتے ہیں۔ مذہبی عقائد از خود نہیں پیدا ہوتے، اور نہ ہی یہ منفرد ہیں۔ اس تحقیق سے طاقتور شواہد ملتے ہیں کہ مذہبی عقائد جانے پہچانے اور عام سماجی دماغی سرکٹ اور ذہنی مکینزم استعمال کرتے ہیں، اور یہ مکینزم ان

مطابقتی افعال کے تحت عمل کرتے ہیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

ایک اور حالیہ تحقیق سیم ہیرس نے کی اور انھوں نے بھی ایف ایم آر آئی استعمال کرتے ہوئے مذہبی اور غیر مذہبی کا اس وقت تجزیہ کیا جب تجربے میں شامل لوگوں کے سامنے مذہبی اور غیر مذہبی مسائل رکھے گئے۔ مذہبی لوگوں کے دماغ کے ان حصوں کے اندر زیادہ فعالیت نظر آئی جو شناخت اور اس بات سے متعلّق تھے کہ افراد دیے گئے مواد سے قطعِ نظر اپنے آپ کو کیسے دیکھتے ہیں اور کیسے پیش کرتے ہیں۔

مرر نیوران

مرر نیوران ہم سب کے دماغوں میں موجود ہیں۔ انھیں تحقیق کاروں نے اتفاقی طور پر دریافت کیا تھا جو 1980ء اور 90 کی دہائیوں میں مک کا (Macaque) بندروں پر تحقیق کر رہے تھے۔ بعد میں ہونے والی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی دماغ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان نیورانز کی دریافت جدید نیوروسائنس کی اہم ترین دریافتوں میں سے ایک ہے۔ یہ نیوران اس وقت فعال ہوتے ہیں جب کوئی جانور کوئی فعل سرانجام دیتا ہے اور جب وہ جانور کسی اور جانور کو وہی فعل سرانجام دیتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہ نیوروان دوسروں کے رویے کی ایسے نقل پیش کرتے ہیں جیسے وہ خود اس عمل میں حصہ لے رہے ہوں۔ چنانچہ یہ کہنا واقعی درست ہے کہ بندر نقال ہوتے ہیں۔

اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ جب آپ اپنا دایاں بازو اُٹھاتے ہیں تو آپ کے دماغ کے بائیں طرف کے وہ نیوران فعال ہو جاتے ہیں جو دائیں ہاتھ کی حرکت کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اگر آپ مجھے یہ کام کرتے ہوئے دیکھیں تو یہی نیوران فعال ہو جائیں گے اگرچہ آپ کا دایاں بازو ساکت ہے۔ اگر میرے دائیں ہاتھ میں چاقو چبھ جائے تو میرے بائیں دماغ کے درد وصول کرنے والے فعال ہو جائیں گے۔ اگر آپ مجھے دیکھیں تو آپ کے دماغ کے یہی حصے حرکت میں آجائیں گے۔

لیکن آپ کو خود یہ تجربہ کرنے کے لیے درد محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر آپ کسی کو کھٹی ٹافی چوستے ہوئے دیکھیں تو آپ بھی زبان پر ترش ذائقہ محسوس کریں گے اور آپ کے منھ میں ایسے ہی پانی آجائے گا جیسے آپ خود وہ ٹافی چوس رہے ہوں۔ یا پھر جب دوسرے جمائیاں لے رہے ہوں تو کوشش کریں کہ آپ جمائی نہ لیں۔

فلاحی کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے والے یہ بات سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا میں بھوک کے بارے میں اعداد وشمار پیش کریں تو شاید کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگے۔ لیکن اگر وہ بھوک سے نڈھال کسی بچے کے تصویر دکھائیں تو لوگوں کی طرف سے چندہ دینے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

2010ء میں ہیٹی میں ہونے والے زلزلے کے بعد دنیا بھر کے لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا تھا کیوں کہ میڈیا نے زلزلے کی تباہ کاریوں کی ہولناک تصاویر نشر کی تھیں۔ ہم سب وہ درد وغم اور بربادی محسوس کر سکتے تھے، اور متاثرین کے مدد کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر مذہب نہ ہوتا تو ہم اخلاق سے عاری ہوتے۔ مررنیوران اس خیال کو رد کرتے ہیں۔ ہم حقیقی معنوں میں دوسروں کا درد محسوس کرتے ہیں، اور یہ ہمارے اندر ہمدردی، دکھ، اور مدد کا احساس بیدار کرتا ہے۔ ہمارے دماغ کی ساخت میں اخلاقیات شامل ہے۔ مذہب اس کو استعمال کرتا ہے، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس طرح برتتا ہے کہ اس سے ہمیں ذہنی جھٹکا پہنچایا جا سکے۔

کتنے عیسائی بچے ہیں جنھیں عیسیٰ کی مصلوبیت کی تصاویر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بہت سے عیسائی سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب بھی اسے دیکھتے ہیں، انھیں درد کا احساس ہوتا ہے، جیسے انھیں صلیب پر میخوں سے گاڑ دیا گیا ہو۔ یہ تصویر ہماری بنیادی اخلاقی صلاحیتوں کو طاقتور طریقے سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔

مشہور اداکار و ہدایت کار میل گبسن ''روایتی'' رومن کیتھولک عیسائی ہیں۔ انھوں

نے اس رجحان کا اپنی 2004ء میں بننے والی فلم دی پیشن آف دی کرائسٹ میں بھرپور استعمال کیا، جس میں تشدد کے اتنے خونی مناظر دکھائے گئے کہ بعض عیسائیوں نے بھی ان پر اعتراض کیا۔ میل گبسن پر یہود دشمنی کا الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ انھوں نے فلم میں تشدد دکھا کر مذہبی عقائد کو مزید گہرا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس فلم کے بارے میں دو دستاویزی فلمیں بن چکی ہیں اور یہ فلم ایک ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہے جہاں اس کے اندر تشدد کے وہ مناظر بھی شامل کیے گئے ہیں جو سینما میں پیش کی جانے والی فلم کے اندر نہیں تھے۔ یہ فلم چرچوں میں تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

بعض جنونی حد تک مذہبی لوگوں جسمانی طور پر سٹگماٹا (Stigmata) بھی ہوا ہے۔ اس میں لوگوں کے ہاتھوں، پیروں اور پہلوؤں میں پراسرار طور پر مصلوب عیسیٰ کی طرح کے زخم لگ جاتے ہیں۔ انھیں عام طور پر ولی کہا جاتا ہے، لیکن زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کا لاشعوری دماغ مصلوب عیسیٰ کی تصویر کو اتنے طاقتور طریقے سے محسوس کرتا ہے کہ خود ان کے جسم پر زخم آجاتے ہیں۔ دماغ کی اس طاقتور صلاحیت کا سائنس نے بھی مشاہدہ کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے وجد کی حالت میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر خود اپنے آپ کو زخم لگائے ہوں۔

اس وقت بہت سے قابلِ تحقیق کار جدید نیورسائنس پر کام کر رہے ہیں تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ دماغ مذہبی خیالات کیسے پیدا اور قبول کرتے ہیں۔ ایک دن ہمارے سامنے مذہب کی نیورو سائنس کی مکمّل تصویر آجائے گی۔ جلد یا بدیر ایسا ہونا ناگزیر ہے۔

کہیں تمھارا امتحان نہ لیا جائے

دماغوں کی تربیت

''علم کے بجائے جہالت زیادہ اعتماد کو جنم دیتی ہے: وہ جو بہت کم جانتے ہیں، زور وشور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنس یہ مسئلہ یا وہ مسئلہ حل نہیں کر سکے گی۔'' (چارلز ڈارون)

1918 میں امریکہ کے سابق وزیرِ خارجہ اور صدارتی امیدوار ولیم جیننگ برائن نے ارتقا کے خلاف ''تادمِ مرگ'' جنگ شروع کر دی۔ یہ جنگ 1925ء کی گرمیوں میں ریاست ٹینیسی کے مشہور مقدمے پر ختم ہوئی جسے سکوپس ٹرائل کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ارتقا نہیں مرا۔ وکیلِ دفاع کلیرنس ڈیرو نے برائن کو گواہوں کے کٹہرے میں آنے کے لیے کہا اور پھر برائن کے بائبل پر مبنی دلائل کو نکتہ بہ نکتہ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہ جرح امریکی قانونی تاریخ کی عظیم ترین جرحوں میں سے ایک ہے۔

برائن اس قدر خجل ہوا کہ پانچ دن بعد مر گیا۔

جان سکوپس پر الزام تھا کہ اس نے ٹینیسی کے بٹلر قانون کی خلاف ورزی کی ہے

جس کے تحت سرکاری سکولوں میں ''کسی بھی نظریے جو بائبل میں دی ہوئی انسان کی آفاقی تخلیق کو رد کر کے یہ پڑھائے کہ انسان نچلے درجے کے جانوروں سے ارتقا پذیر ہوا ہے'' پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ یہ فیصلہ بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ اگرچہ برائن عدالتی لڑائی جیت گیا لیکن اسے آخر کار جنگ میں شکست ہوئی۔

لیکن بڑی جنگ ابھی جاری ہے۔ بٹلر قانون تقریباً چالیس سال تک نافذ رہا اور ارتقا پڑھانے کے قانونی مسائل جمود کا شکار رہے حتیٰ کہ 1967ء میں ایک اور استاد نے امریکی آئین کی پہلی ترمیم کا سہارا لیتے ہوئے اسے چیلنج کر دیا۔

1960ء کے وسط سے اب تک ارتقا پڑھانے کے خلاف تیرہ بڑے مقدمات چل چکے ہیں، جن میں سے دو سپریم کورٹ تک پہنچے۔ مذہبی دائیں بازو سے تعلّق رکھنے والوں نے یہ کہہ کر ارتقا کی تعلیم کو پٹڑی سے ہٹانے کی کوشش کی ہے کہ تخلیق کی سائنس اور عاقل تخلیق (intelligent design) کو ارتقا کے ساتھ ساتھ پڑھایا جائے۔ لیکن جب بھی یہ مسئلہ عدالتی فیصلے کی نوبت تک پہنچا ہے، سائنس ہی کی جیت ہوئی ہے۔

2005ء میں پین سلوینیا کے وفاقی جج جان ای ثالث نے نویں جماعت میں ارتقا کے متبادل کے طور پر عاقل تخلیق پڑھانے کے ضرورت کو رد کر دیا۔ اس کیس میں کینھ ملر نامی ایک حیاتیات دان نے، جو کیتھولک مذہب پر عمل پیرا تھا، کزملر بنام ڈوور ایریا سکول ڈسٹرکٹ کیس (Kitzmiller v. Dover Area School District) میں سائنسی نظریے کے حق میں بیان دیتے ہوئے اس کی صحت کی تصدیق کی اور کہا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس کے الفاظ میں سکوپس مقدمے کی ''تعلیمی آزادی'' نامی مشہور تقریر کی بازگشت سنائی دی جو کلیرنس ڈیرو کے معاون وکیل ڈڈلی میلون نے کی تھی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ڈوور کیس سائنس اور سائنسی تعلیم کے لیے بہت بڑی فتح ثابت ہوا۔ لیکن جج جان نے اپنے فیصلے میں مذہب اور سائنس کے درمیان تضاد کا

ذکر کر کے ملر اور میلون کے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔

مصلحت اندیشی کی خاطر یہ کہہ دینے کے باوجود کہ مذہب اور سائنس میں تضاد نہیں ہے، تمام امریکہ میں سکولوں کے اجلاسوں میں اور تعلیمی کمیٹیوں میں مسلسل تنازعات کھڑے ہوتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اور سائنس کے درمیان تضاد موجود ہے۔

مذہبی عقائد صدیوں تک کائنات کے آغاز، انسان کی فطرت اور آغاز، اور کائنات کی ماہیت کے بارے میں دعوے کرتے رہے ہیں۔ سائنس نے ان دعووں اور توضیحات کو مسکت طریقے سے رد کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں اسے خطرات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے، جیسے کہ اگر گلیلیو زندہ ہوتا تو آپ کو بتاتا۔ سچ کی اصل تلاش دکھاتی ہے کہ آج کی دنیا کا انسان دراصل ایک افریقی بندر ہے، جو آخری بچ جانے والا ہومی نِڈ ہوموسیپینز ہے۔

جیسا کہ ہم نے باب سوم میں کہا تھا، ڈارون تک کو مذہب ترک کرتے ہوئے مشکل ہوئی تھی، یہ الگ بات کہ اس کے پاس اس تجرباتی علم کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو آج ہمارے پاس ہے۔ وہ دماغی مکینزم جو ہمیں مذہبی خیالات کے لیے زد پذیر بناتے ہیں، وہ بہت گہرے گڑے ہوئے ہیں۔ جب ان کا بچوں کی سماجی برین واشنگ سے ملاپ ہوتا ہے تو ہمارے سامنے اندھے اعتقاد اور عاقل تجسّس کے ساتھ ٹکراؤ کا منظر آ کھڑا ہوتا ہے۔

جیسا کہ سابق مذہبی معتقد اور ارتقائی حیاتیات دان جیری کوئن نے کہا ہے،

''مذہب میں اعتقاد اچھی چیز ہے لیکن سائنس میں یہ برائی ہے۔''

اور جیسا کہ کوئی بھی سابق مذہبی شخص آپ کو بتائے گا، مذہبی یقین رکھنا نہ رکھنے کے مقابلے پر کہیں زیادہ آسان ہے۔ مذہب لگے بندھے اصولوں کا مجموعہ پیش کرتا ہے، جسے جب ہمارے مطابقتی ذہنی مکینزموں سے ملایا جائے تو یہ اس معاملے پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ختم کر دیتا ہے۔ 2010ء میں رائے عامہ کا جائزہ لینے والے ادارے پیو پول نے معلوم کیا کہ دہریوں کو مذہبی لوگوں کے مقابلے پر دنیا کے مذاہب کے بارے میں زیادہ معلومات تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان معاملات پر زیادہ سوچ بچار کیا ہے۔

لیکن اب بھی امید باقی ہے۔ چھ جون 2010ء کو امریکی چینل اے بی سی پر انٹرویو دیتے ہوئے مشہور طبیعات دان سٹیون ہاکنگ نے، جسے بہت سے لوگ دورِ حاضر کا سب سے بڑا سائنس دان سمجھتے ہیں، کہا ''مذہب اور سائنس کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ مذہب کی بنیاد بالادستی پر ہے، جب کہ سائنس کی بنیاد مشاہدہ اور عقل ہے۔ سائنس جیتے گی کیوں کہ یہ کام کر کے دکھاتی ہے۔'' جیسا کہ بہت سے لوگ جانتے ہیں، سائنس کی مدد کے بغیر ہاکنگ بہت پہلے اپنی خطرناک بیماری اے ایل ایس کا نشانہ بن جاتے، چاہے کتنے ہی لوگ ان کے لیے دعائیں کرتے۔ اس کے باوجود ان کا تیز دماغ اب بھی کام کر رہا ہے اور وہ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اب بھی نئی چیزیں سیکھتے اور پڑھاتے ہیں۔

جیسا کہ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے، سائنس، اور بالخصوص ادراکی سائنس، ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی دماغ کب اور کیسے مذہبی خیالات تخلیق کرتا ہے۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ مذہب کے نفسیاتی مکینزم، نیوروانا ٹمی، اور نیوروکیمسٹری مزید واضح ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بہت جلد کوئی جان یا جین سکوپس کسی سرکاری سکول میں مذہب کی ادراکی نیورو سائنس پڑھا رہے ہوں گے۔ جب یہ مضامین پڑھائے جا رہے ہوں گے تو آپ امریکہ کے بنیاد پرست عیسائیوں کی ردِعمل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ معاملہ عدالت میں لے جائیں گے۔ یہ کیس بالآخر کسی وفاقی عدالت، اور ممکنہ طور پر سپریم کورٹ میں سنا جائے گا۔ ہمیں اس مقدمے کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اس سے ان دریافتوں کو مزید شہرت ملے گی جن سے معلوم ہوا ہے کہ انسانی ذہن کس طرح مذہبی عقائد تخلیق کرتا اور انھیں پروان چڑھاتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سائنس جیت جائے گی۔

مذہب ایک بے رحم دنیا میں تسکین ضرور فراہم کرتا ہے، اور ہمارے لیے سماج تخلیق کرتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے تنازعات بھی جنم لیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن اسے انسانوں نے تخلیق کیا تھا، اور اگر ہم یہ بات تسلیم کر لیں تو دنیا ایک بہتر جگہ بن سکتی ہے۔

نوٹس

ہیلیکس نیبولا کا یہ فوٹو ناسا نے ہبل خلائی دوربین اور ایری زونا میں واقع کٹ پیک قومی رصدگاہ کی مدد سے لیا تھا۔ جب یہ تصویر پہلی بار دس مئی 2010ء کو سامنے آئی تو بہت سی ای میلوں میں اسے ''خدائی آنکھ'' سے تعبیر کیا گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس تصویر کو دیکھ کر کئی معجزے رونما ہوئے ہیں۔

تمہید

خودکش دہشت گردی پر میرے مضامین اور پریزنٹیشنز کے لیے میری ویب سائٹ دیکھیے www.jandersonthomson.com

یہ تصور ماہرِ طبیعات سٹیون وائن برگ کا ہے کہ ہم انسانیت پر سے مذہب کی گرفت نرم کرنے کے لیے جو بھی کام کرتے ہیں، وہ تہذیب کے لیے ایک دھچکا ہوتا ہے۔ یہ بات انھوں نے 2006ء میں سان ڈی ایگو میں ''بیانڈ بیلیف'' نامی ایک سمپوزیم میں کہی تھی۔ اس سمپوزیم میں کئی عمدہ تقریریں کی گئی تھیں۔ میں خاص طور پر ماہرِ فلکیات نیل ڈی گراس ٹائسن کی پریزنٹیشن دیکھنے کی سفارش کرتا ہوں۔

باب اوّل

''ڈارون کا قدرتی انتخاب کے ذریعے ارتقا کا نظریہ نہ صرف ہمارے وجود، بلکہ کائنات میں کہیں بھی زندگی کے وجود کی واحد قابلِ قبول توجیہہ ہے۔ یہ جانوروں، پودوں، کائی، اور بیکٹیریا کے رنگارنگ تنوع کی واحد توجیہہ ہے۔ قدرتی انتخاب ہر جاندار اور ہر عضو کے خوبصورت ''ڈیزائن'' کی واحد قابلِ قبول توجیہہ ہے۔ ارتقا کا علم روزمرہ کاروبار کے لیے ضروری نہیں ہے۔ آپ ڈارون کا نام سنے بغیر زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن اگر مرنے سے پہلے آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کس لیے جی رہے تھے تو آپ کو ڈارون کی نظریات کا لازماً مطالعہ کرنا پڑے گا۔'' رچرڈ ڈاکنز، جان مینارڈ سمتھ کی ''تھیوری آف ایولوشن'' کا دیباچہ۔ (مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1993)

"Richard Dawkins, forewordto John Maynard Smith's The Theory of Evolution,Canto ed." (Cambridge: Cambridge University Press, 1993)

یہ بیان کہ ارتقا چند مسئلے حل کرنے والے آلات کا منظّم مجموعہ ہے، ڈونالڈ سائمنز کا ہے، جو انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا:

"Adaptationism and Human Mating Psychology, in the Handbook of Evolutionary Psychology, ed. David M. Buss (Hoboken, NJ: John Wiley & Sons, 2005)."

''ذہن وہ کچھ ہے جو دماغ کرتا ہے۔'' اور دماغ کی خلائی جہاز کے ساتھ تمثیل سٹیون پنکر کی کتاب

"Steven Pinker's How The Mind Works (New York: Norton, 1997)."

ایک یا ایک سے زیادہ مقدس ہستیوں پر یقین: اگرچہ کیتھولک مذہب اور یونانی اور مشرقی آرتھوڈاکس مذاہب کو وحدانی مذاہب سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ دراصل متعدد خداؤں

والے مذاہب کی طرح عمل کرتے ہیں۔

ولی مافوق الفطرت ہستیاں ہوتے ہیں جو مذہب کے انسانی تخلیق ہونے کا عمدہ ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اگر کیتھولک اپنے آپ سے مخلص ہوکر بات کریں تو انھیں پتا چلے گا کہ ولی چھوٹے دیوتا ہیں۔ اگر آپ کی کوئی چیز کھو جائے تو آپ سینٹ اینٹنی سے دعا مانگتے ہیں، اور اگر آپ کوئی ناممکن کام کروانا چاہتے ہوں تو سینٹ جوڈ کی منت مانگتے ہیں۔ اپنے مخصوص ''کشف'' کی وجہ سے سینٹ جوڈ 1950ء کے عشرے میں ٹیلی ویژن کی پیٹرن سینٹ بن گئی تھی۔ وہ بوڑھی عمر میں کرسمس کے لیے چرچ نہیں جا سکتی تھی، اس لیے اس نے کہا وہ مذہبی تقریب اپنے حجرے کی دیواروں پر دیکھ سکتی ہے۔

اگرچہ ولی چھوٹے خداؤں کے سے فرائض سرانجام دیتے ہیں، ان کی مافوق الفطرت طاقت دراصل ودیعت کردہ ہوتی ہے، اس لیے انھیں آسمانی ترغیب کار (lobbyist) بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیتھولک ولیوں سے مانگتے ہیں، لیکن وہ انھیں یہ نہیں کہتے کہ وہ ان کی دعائیں مستجاب کریں۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ صرف خدا ہی ہر کام کر سکتا ہے۔ کیتھولک خداؤں تک رسائی مانگتے ہیں، اور ولیوں سے کہتے ہیں کہ وہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ بنیں۔ یہ فرق بڑی چالاکی سے کثیر پرستی (polytheism) کے الزام سے پہلو بچا جاتا ہے۔ ولی بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن خدا صرف ایک ہے (تثلیث کو چھوڑ کر)۔

کسی کو ولی کے عہدے پر تفویض کرنے کا عمل کسی مقدس شخص سے شروع ہوتا ہے جسے لوگ جانتے ہیں۔ پھر لوگ اس کی پاکبازی اور تقویٰ کے شواہد پیش کرنے لگتے ہیں۔ ولایت کے شواہد کرامات کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ اگر آپ اس بارے میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ بات اس ممکنہ ولی کے تصور کی نفی کرتی ہے کہ وہ محض خدا سے معجزات کی درخواست کرتا ہے۔ پادری بھی اس عمل میں شریک ہوکر یہ معلومات ایک بشپ تک پہنچاتا ہے، جو اسے اپنے متعلّقہ افسرانِ بالا تک پہنچاتا ہے۔

بالآخر بات کارڈینل سے ہوتے ہوئے پوپ تک پہنچ جاتی ہے۔ ولی بننے کے

لیے عام طور پر ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم تین طبعی کرامات اس شخص سے منسوب کی جائیں۔ البتہ شہید کی موت مرنے سے یہ شرط محض دو کرامات تک محدود ہو جاتی ہے۔ (اس کو ایک اور مذہب میں خودکش حملہ آوروں کے تناظر میں دیکھیے۔)

ولایت کا یہ عمل اس بات کی عمدہ مثال ہے کہ مذہب انسانوں نے بنائے ہیں۔ حالیہ برسوں میں اس بات کے الزامات لگتے رہے ہیں کہ پوپ نے ولایت کے عمل کو سیاسی وجوہات کی بنا پر تیز تر کر دیا۔ (سنڈے ٹائمز، لندن، 18 فروری 2008ء) دوسری طرف بعض ولیوں کو دائرہ ولایت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً سینٹ کرسٹوفر جو مسافروں کے ولی ہیں، اور جن کی تصویریں ٹیکسیوں کے اندر لگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، انھیں ویٹیکن نے ''غیر ولی'' قرار دے دیا ہے۔ ان باتوں کی وجہ سے عیسائیت اور ہندومت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا جسے مشرکانہ مذہب سمجھا جاتا ہے، اور جس میں ایک خدا کا تصور تو ہے لیکن اس میں دوسرے خداؤں کا وجود بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

باب دوم

''ہم اُٹھنے والے بندر ہیں، نہ کہ گرنے والے فرشتے۔'' یہ فقرہ ولیم ایلمین کے سٹون ایج پریزنٹ میں سے لیا گیا ہے: ارتقا نے جنس، تشدد، زبان، جذبات، اخلاقیات، اور معاشروں کو کس طرح وضع کیا ہے۔ (نیویارک: ٹچ سٹون، 1994)

"William Allman's Stone Age Present: How Evolution Has Shaped Modern Life-From Sex, Violence and Language to Emotions,Morals and Communities (New York: Touchstone, 1994)."

میری پسندیدہ کہانیوں میں سے ایک: ایک چھوٹی سی بچی انسانوں کے ارتقا کے بارے میں پڑھنے کے بعد گھر آئی۔ اس نے اپنی ماں سے پوچھا، ''کیا ہم بندروں سے نکلے ہیں؟'' ماں نے کہا ''ہاں، ایک لحاظ سے۔ ہم بندروں اور بوزنوں سے نکلے ہیں۔'' بچی نے

پوچھا ''تو پھر بندر کہاں سے نکلے ہیں؟''

ماں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور جواب دیا ''کینسس سٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن سے۔''

ارتقا کا جائزہ نکولس ویڈ کی کتاب ''صبح سے پہلے: ہمارے اجداد کی گم گشتہ تاریخ کی بازیافت'' (نیویارک: پنگوئن پریس، 2006ء) اور کرسٹوفر سلواین کی کتاب ''انسان ہونے کا مطلب کیا ہے۔'' (واشنگٹن ڈی سی: نیشنل جیوگرافک پریس، 2010ء) سے لیا گیا ہے۔(National Geographic Press, 2010).

"NicholasWade's Before the Dawn: Recovering the Lost History of OurAncestors (New York: Penguin Press, 2006) and Richard Pottsand Christopher Sloan's What It Means to Be Human (Washington, DC: National Geographic Press, 2010)."

مجھے یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ میں نے رچرڈ ڈاکنز، ٹاڈ سٹائفل، گریگ لینگر اور ہارورڈ کے ایک گروپ کے ساتھ واشنگٹن ڈی سی کے سمتھ سونین میوزیم میں انسان کے آغاز کے بارے میں نمائش ڈائریکٹر رچرڈ پاٹس کے ساتھ دیکھی۔ بعد میں انھوں نے کمالِ مہربانی سے ارتقا پر میرا خلاصہ پڑھا تا کہ اس کی صحت کی تصدیق کی جا سکے۔ اگر ممکن ہو تو آپ بھی یہ نمائش ضرور دیکھیں۔ یہ تعلیم کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

ہم ایک سماجی نوع ہیں جس کی تعاون کی صلاحیت کو بڑے پیمانے پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سارہ ہرڈی کی کتاب ''مائیں اور دوسرے: ارتقا اور باہمی تفہیم'' کا پہلا باب ''میدان میں بندر'' پڑھیں۔ (کیمبرج، میساچوسٹس: بیلنیپ پریس آف ہارورڈ یونیورسٹی پریس، 2009).(Belknap Press of Harvard University Press, 2009)

"Sarah Hrdy's book Mothers and Others: The Evolution of Mutual Understanding.

(Cambridge, MA: Belknap Press of Harvard University Press, 2009)."

ہم ایک جہاز میں جمع ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے کو سامان اُٹھانے اور اوپری خانے میں رکھنے میں مدد دے سکتے ہیں، اور مشکل لوگوں اور چیختے ہوئے بچوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس جہاز میں انسان کی بجائے چمپینزی سوار ہوتے تو جہاز لینڈ کرتے وقت اس میں جسموں کے چیتھڑے بکھرے ہوتے۔

میں مذہب بطور فاسٹ فوڈ کے تصور کے لیے روبن کورن ویل کا ممنون ہوں۔

ہمارے اذہان کے ''دوبارہ کرو'' مراکز کا تصور ٹیری برنہیم اور جے فیلن کی کتاب ''مین جینز: جنس سے دولت اور خوراک تک: اپنی بنیادی جبلّتوں کو قابو کرنا۔''

"Terry Burnham and Jay Phelan, Mean Genes: From Sexto Money to Food: Taming Our Primal Instincts (New York: Penguin Press, 2000)."

اپنے آپ کو نظریۂ ارتقا، جدید ڈاروینین تالیف اور اس کے شواہد کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے: دا بلائنڈ واچ میکر (نیویارک: نورٹن، 1996ء)، دا سیلفیش جین (نیویارک: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2009ء)، اور دا گریٹسٹ شو آن ارتھ (نیویارک: فری پریس، 2009ء)۔ یہ تمام کتابیں رچرڈ ڈاکنز کی تحریر کردہ ہیں۔

"The Blind Watchmaker (New York: Norton, 1996), The Selfish Gene, 30th anniversary ed. (New York: Oxford University Press, 2006), and The Greatest Show on Earth (New York: Free Press, 2009), all by Richard Dawkins."

باب سوم

موار یکٹس عورت کی وٹامن اے کی قلت کی وجہ سے ہونے والی بیماری کا احوال

ایلن واکر اور پیٹ شپمین کی کتاب 'داوز ڈم آف دا بونز: انسان کے آغاز کی تلاش میں' سے لیا گیا ہے:

"Alan Walker and Pat Shipman's The Wisdom of the Bones: In Search of Human Origins (New York: Knopf, 1996)"

ان کی کچھ ہڈیاں واشنگٹن ڈی سی کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے انسانی ابتدا کے ہال میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یوم خمیسی عیسائیوں کی خدا تک پہنچنے اور بچے کے والدین تک پہنچنے کی مماثلت لی کرک پیٹرک کی فکر کا نتیجہ ہے جنھوں نے وابستگی کی نظام اور مذہب کے درمیان گہرے تعلّق کا مطالعہ کیا ہے (ذاتی گفتگو، 2010ء)۔

ان کی کتاب ملاحظہ کریں:

"Attachment, Evolution, and the Psychology of Religion (New York: Guilford Press, 2005)."

اس کے علاوہ جان بولبی کی کتاب بھی دیکھیں:

"John Bowlby, Attachment (New York: Basic Books, 1969)."

میری اینسورتھ یونیورسٹی آف ورجینیا میں نفسیات کی پروفیسر تھیں، جن کی انسان دوستی اور محبّت میرے ذہن میں روشن ہے۔

اینسورتھ اور بولبی کے کام کا بہترین تعارف رابرٹ کیرن کی ''بیکمنگ اٹیچڈ'' میں دیکھا جا سکتا ہے جو اٹلانٹک منتھلی میں شائع ہوا، اور بعد میں کتاب کی شکل اختیار کر گیا، بیکمنگ اٹیچڈ: پہلے تعلّقات اور وہ کیسے ہماری محبّت کرنے کی صلاحیت کی تشکیل کرتے ہیں (نیویارک: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 1994ء)۔

"Becoming Attached: First Relationships and How They Shape Our Capacity to Love (New York: Oxford University Press, 1994)."

فرینک سلووے نے چارلز ڈارون کے 1830ء کے عشرے کے اختتامی برسوں کے بارے میں ایک زبردست مضمون لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ جب ڈارون نے قدرتی چناؤ دریافت کیا تھا۔

''ڈارون نے عاقل تخلیق (intelligent design) کو کیوں مسترد کیا۔'' یہ مضمون انٹیلی جنٹ تھاٹ رسالے میں شائع ہوا۔

"Why Darwin Rejected Intelligent Design," in Intelligent Thought: Science versus the Intelligent Design Movement, ed. John Brockman New York: Vintage, 2006)."

بیٹی کے انتقال کے ڈارون پر ہونے والے اثر کو اس کے خاندان کے ایک فرد رینڈل کینز نے بہت عمدگی سے بیان کیا ہے:

چارلز ڈارون، اس کی بیٹی اور انسانی ارتقا (لندن: فورتھ اسٹیٹ، 2001)۔

"Randal Keynes in Annie's Box: Charles Darwin, His Daughter and Human Evolution (London: Fourth Estate, 2001)."

ڈارون کی بنیادی سوانح دو جلدوں پر مشتمل ہے جو جینٹ براؤن نے لکھی ہے۔ اس کا نام ہے وایجنگ (نیویارک:

"Voyaging (New York: Knopf, 1995) and The Power of Place (Princeton, NJ: Princeton University Press, 2003)."

باب چہارم

جسم اور ذہن کی دوئی کے بارے میں یہ معلومات کہ یہ ہمارے دماغ کے ڈھانچے کا حصہ ہے، میتھیو براؤن کے مضمون سے لی گئی ہیں ''وہ کیا چیز ہے جو بڑے خیالات کو چپکنے والا بناتی ہے؟'' یہ میکس براؤن کے مولفہ کتاب '' آگے کیا ہوگا: سائنس کے

مستقبل کے بارے میں چند خیالات'' میں شامل ہے۔

"What Makes Big Ideas Sticky?" in Max Brockman's edited volume What's Next: Dispatches on the Future of Science (New York: Vintage, 2009)."

جیسی بیرنگ کے کام اور خلاقانہ تجربات کا خلاصہ ان کے مضمون ''مافوق الفطرت میں یقین کی ادراکی نفسیات'' میں دیا گیا ہے۔ یہ مضمون جریدے امریکن سائنٹسٹ 92 (2006ء) میں شائع ہوا تھا۔

"The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 142-149"

وہ اچھا لکھتے ہیں، ان کے سائنٹفک امریکن مائنڈ کے لیے لکھے گئے مضامین پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی کتاب بھی ضرور پڑھیے: بنیادی جبلّت: روح، قسمت، اور زندگی کے مقصد کی نفسیات۔ یہ کتاب 2011 میں شائع ہو رہی ہے۔

"The Belief Instinct: The Psychology of Souls, Destiny, and the Meaning of Life."

بچوں کے تخیلاتی ساتھی کے اثر کے بارے ایک عمدہ احوال میں رچرڈ ڈاکنز کی کتاب داگاڈ ڈیلیوژن میں ''دالٹل پرپل مین'' نامی مضمون میں پڑھیے۔

"The little purple man" in Richard Dawkins' The God Delusion (New York: Houghton Mifflin, 2006), 349."

باب پنجم

یہ کتاب مذہب کے ذیلی پیداوار نظریے کی وضاحت کرتی ہے۔

ایک اور نظریہ بھی ہے کہ مذہبی عقیدہ انسانی فطرت کا ایک الگ دوررس پہلو ہے

اور گروپ سلیکشن کے عمل کی پیداوار ہے۔ اس نظریے میں دلچسپی رکھنے والے ڈیوڈ سلوئین ولسن کی کتاب ڈارونز کیتھیڈرل: مذہب اور معاشرے کی فطرت پڑھ سکتے ہیں۔ (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، 2002)۔ اس کے علاوہ نکولس ویڈ کی کتاب فیتھ انسٹنکٹ: مذہب کیسے پروان چڑھا اور یہ کیوں آج تک برقرار ہے۔

"David Sloan Wilson's Darwin's Cathedral: Evolution, Religion and the Nature of Society (Chicago: University of Chicago Press, 2002) and Nicholas Wade's Faith Instinct: How Religion Evolved and Why It Endures (New York: Penguin Press, 2009)."

گروپ سلیکشن بمقابلہ ذیلی پیداوار کی بحث کے لیے رچرڈ سوسس کا مقالہ پڑھیے:

"The Adaptationist-Byproduct Debate on the Evolution of Religion: Five Misunderstandings of the Adaptationist Program," Journal of Cognition and Culture 9:? The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 315-332. "

مذہب کے کرداری پہلو کے لیے:

"Lyle Steadman and Craig Palmer's The Supernatural and Natural Selection: The Evolution of Religion (Boulder, CO: Paradigm Publishers, 2008)"

مذہب کے لیے دولخت ادراک کی اہمیت اس کتاب میں اچھے طریقے سے بیان کی گئی ہے:

"Pascal Boyer's Religion Explained: The Evolutionary Origin of Religious Belief (New York: Basic Books, 2001)

Robert Dunbar's explanation of religion's use of intensionality is found in "We Believe," New Scientist 189 (2006): 30-33.

"The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 30-33."

یہ نظریہ کہ ہم سب ایثار پسند پیدا ہوئے ہیں اور بعد میں حکمتِ عملی کے طور پر مطلب پسند بن جاتے ہیں، مائیکل ٹوماسیلو کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ جرمنی کے شہر لائپزگ کے میکس پلانک انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ وہ افزائشی نفسیات دان ہیں اور میک پلانک انسٹی ٹیوٹ کے ارتقائی علمِ بشریات کے سربراہ ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے بچوں اور چمپینزیوں میں باہمی تعاون کی صلاحیتوں اور ایک دوسرے کے مقاصد کو سمجھنے پر کیے جانے والے تجربات دیکھنے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ٹوماسیلو اور اس کے گروپ نے کئی مضامین لکھے ہیں، اور ان کی کتاب کا عنوان ہے

"Why We Cooperate (Cambridge, MA: MIT Press, 2009)"

زبان کے مشترکہ نیتوں سے جنم لینے کا خیال ٹوماسیلو کی اس کتاب میں ملتا ہے:

"Origins of Human Communication (Cambridge, MA: MIT Press, 2010)"

مزاحیہ فلمی اداکار سچا بیرن کوہن کے ایک کزن ہیں سائمن بیرن کوہن، جو کیمبرج یونیورسٹی میں نفسیات دان ہیں۔ انھوں نے آٹزم اور ایسپر گرز سنڈروم پر بیش بہا تحقیق کی ہے۔ ان کے تصور کے مطابق مردوں کے دماغ زیادہ نظام سازی کا رجحان رکھتے ہیں جب کہ عورتوں کے دماغوں میں ہمدردی کے جذبات زیادہ ہوتے ہیں۔

عورتوں میں تصورِ ذہن کے مطابق زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ آٹزم سپیکٹرم کی بیماری مرد دماغ کی انتہائی شکل پیش کرتی ہے۔ انھوں نے بہت سے سائنسی مقالہ جات اور

عام قاری کے لیے ایک سلیس کتاب لکھی ہے:

"The Essential Difference: Male and Female Brains and the Truth about Autism (New York: Basic Books, 2003)"

مردوں کو ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہوئے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ تحقیق سے بہت پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کے لیے بھی انسانی چہروں کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ منتقلیِ جذبات کا دماغ کے ایک نارمل نفسیاتی مکینزم کی حیثیت سے بیان رینڈولف نیس اور ایلن لوئڈ کے لکھے ہوئے ایک باب میں پایا جاتا ہے۔

"The Evolution of Psychodynamic Mechanisms," in The Adapted Mind: Evolutionary Psychology and the Generation of Culture, ed. Jerome Barkow, Leda Cosmides, and John Tooby (New York: Oxford University Press, 1992)"

باب ششم

''ضرورت سے زیادہ فعال عامل تلاش کرنے کا آلہ'' کا تصور جسٹن بیرٹ کی کتاب سے لیا گیا ہے:

"Why Would Anyone Believe in God? (Lanham, MD: AltaMira Press, 2004)"

یہ ایک زبردست کتاب ہے جس میں مذہب کے استعمال کردہ بہت سے ادراکی مکینزموں کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ البتہ اس کتاب کے آخر میں پوری کتاب کو مجروح کرنے والا ایک پیراگراف ہے جس میں غیر متوقع طور پر عیسائی مذہب کا اعتراف کیا گیا ہے۔ انسانی کی طرف سے مذہب کی تجسیمِ انسانی کرنا (anthropomorphize) سٹیوارٹ گتھری کی کتاب کا موضوع ہے،

"Faces in the Cloud:A New Theory of Religion (New York: Oxford University Press, l993)"

رچرڈ کراس یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں نفسیات کے پروفیسر ہیں۔انھوں نے مجھ سے انسانی ذہنوں میں ہمارے آسٹریلوپیتھی سین اجداد کے ذہنوں سے منتقل ہونے والے مکینزموں کا تصور اور شواہد بیان کیے۔ ہماری کم سے کم خلافِ توقع دنیاؤں کی تعمیر کی عجیب عادت مذہبی عقائد کی ادراکی نیوروسائنس کی اساس ہے۔اس کو پاسکل بوئر کی کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔

"Religion Explained: The Evolutionary Origin of Religious Belief (New York: Basic Books, 2001) and Scott Atran's In Gods We Trust: The Evolutionary Landscape of Religion (New York: Oxford University Press 2002)"

ہم سب کو لٹل ریڈ رائڈنگ ہڈ کی کہانی کیوں یاد ہے؟

اس میں دو کم سے کم خلافِ توقع واقعات ہیں۔بولنے والا بھیڑیا اور بچی کا بھیڑیے کے پیٹ سے صحیح سلامت باہر نکل آنا۔

"The Evolution of Psychodynamic Mechanisms," in The Adapted Mind: Evolutionary Psychology and the Generation of Culture, ed. Jerome Barkow, Leda Cosmides, and John Tooby (New York: Oxford University Press, 1992)"

ہم کم سے کم خلافِ توقع خیالات کو عام قرینِ قیاس خیالات یا بیسر و پا خیالات کے مقابلے پر زیادہ بہتر طریقے سے یاد رکھتے ہیں۔

اس کے تجرباتی شواہد کے لیے دیکھیے:

"Memory and Mystery: The Cultural Selection

of Minimally Counterintuitive Narratives" by Ara Norenzayan, Scott Atran, Jason Faulkner and Mark Schaller in Cognitive Science 30 (2006): "The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 531-553."

یہ مضمون دکھاتا ہے کہ کیسے کم سے کم خلافِ توقع عناصر کامیاب لوک کہانیوں اور مذہبی بیانیوں میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

مافوق الفطرت عناصر روزمرہ کی زندگی سے جڑے رہتے ہیں اور انسان کے ان بنیادی وجودی مسائل کو حل کر سکتے ہیں جو منطقی طور پر عقل کی پہنچ سے باہر ہوں، جیسے موت۔ انھیں آسانی سے یاد رکھا جا سکتا ہے، دہرایا جا سکتا ہے اور اگلی نسل تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ مذہب کی ادراکی نیوروسائنس کا ایک عام فہم خاکہ ٹاڈ ٹریملن کی کتاب میں ملتا ہے۔

"Minds and Gods: The Cognitive Foundations of Religion (New York: Oxford University Press, 2006)."

کسی بھی کتاب کے اہم ترین مقدمات میں سے ایک میں رابرٹ ٹریورز رچرڈ ڈاکنز کی 1976ء میں شائع ہونے والی کتاب The Selfish Gene میں دیے گئے خودفریبی کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ مقدمہ کتاب کے تیرھویں یادگاری ایڈیشن میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وجدانی موحدین (intuitive theists) اور مخلوط فلسفۂ غایات (promiscuous teleology) کا تعارف سب سے پہلے ڈیبورا کیلی مین نے کروایا تھا۔

"Are Children Intuitive Theists? Reasoning about Purpose and Design in Nature," Psychological Sciences 15 (2004): 295-301"

روبن کورن ویل اسی تصور کی توسیع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملحد صرف مورچوں میں پائے جاتے ہیں۔

مذہبی لوگ صحت کا بیمہ کرواتے ہیں، اپنے بچوں کو کار سیٹوں میں بٹھاتے ہیں، اور دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس طرح سے عمل کریں جیسے دنیا میں کوئی آفاقی تحفّظ نہیں پایا جاتا۔ اگر آپ فوج میں ہیں تو اس تنظیم میں شمولیت کے بارے میں سوچئے:

"Military Association of Atheists and Freethinkers, www.militaryatheists.org."

ارتقا کو سمجھنے میں ہمیں جو مشکل پیش آتی ہے اس کا ڈینیئل ڈینیٹ کے لیکچر میں بہت عمدگی سے احاطہ کیا گیا ہے:

"Human Nature and Belief," Darwin Festival, Cambridge University, July 8, 2009"

یہ آپ کو گوگل پر آسانی سے مل جائے گا۔

انھوں نے کمپیوٹروں کی تمثیل استعمال کی ہے جو ریاضی سمجھے بغیر پیچیدہ ریاضیاتی کلیے حل کر سکتے ہیں۔ ہم تفہیم کے بغیر اہلیت کے تصور سے نا آشنا ہیں۔ قدرتی چناؤ ہمیں بغیر کسی تخلیق کار کے خوب صورت ڈیزائن، اور بغیر عقل بغیر عاقل کے دیتا ہے۔ سوچنے کی صلاحیت ایک حالیہ ارتقائی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔

''خدائی آنکھ'' والی تصویر نے مذہبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

2003ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آنے والی یہ تصویر جنگل کے آگ کی طرح دنیا بھر میں ای میل کے ذریعے پھیل گئی۔ کچھ لوگوں نے اس کی مدد سے فریب کرنا شروع کر دیے۔

snopes.com نامی ویب سائٹ پر دی گئی ایک ای میل کے مطابق:

''یہ نادر تصویر ناسا نے لی ہے۔

اسے خدائی آنکھ کہا جاتا ہے۔

یہ مظہر ہر تین ہزار سال بعد رونما ہوتا ہے۔

یہ تصویر بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں معجزے دکھا چکی ہے۔

آپ بھی کوئی خواہش کریں۔۔۔ آپ نے خدا کی آنکھ میں جھانک کر دیکھا ہے۔

آپ یقیناً ایک دن کے اندر اندر اپنی زندگی میں تبدیلیوں محسوس کریں گے۔
چاہے آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں لیکن اس ای میل کو خود تک محدود نہ رکھیں۔
اسے کم از کم سات لوگوں تک پہنچائیں۔''

اس ویب سائٹ کی مطابق ''یہ تصویر ہیلکس نیبیولا کی تصویر ہے۔ یہ واحد تصویر نہیں ہے بلکہ ناسا کی ہبل دوربین اور ایک زمینی دوربین سے لی گئی تصاویر کا مجموعہ ہے۔''

ویب سائٹ میں مزید لکھا ہے ''ہیلکس نیبیولا کے وہ رنگ نہیں ہیں جو اس تصویر میں نظر آرہے ہیں۔۔۔اس کے رنگ مصنوعی ہیں۔''

اس کا نام ''خدائی تصویر'' ایک مداح نے رکھا، نہ کہ ناسا نے۔اور یہ نیبیولا ہر وقت نظر آتا رہتا ہے، نہ کہ ہزاروں برس میں ایک دفعہ۔''

ایک خلائی بادل کی مصنوعی رنگ شدہ تصاویر کے مجموعے کو خدا کے آنکھ سمجھ لینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان کے اندر خدا تخلیق کرنے کی اہلیت اور ضرورت موجود ہے۔

باب ہفتم

انٹرنیٹ پر ڈھونڈنے سے Stanley Milgram کے کام اور ویڈیو مل جائیں گی جن میں ان کی دریافتیں بیان کی گئی ہیں۔

اخلاقیات کی نفسیات اور ادراکی نیوروسائنس میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک اہم ترین جگہ جوناتھن ہیڈٹ Jonathan Haidt's کی ویب سائٹ اور ان کی کئی تحریریں ہیں۔

"Morality: A Comprehensive Review of Moral Psychology"

یہ وہ باب ہے جو انھوں نے Handbook of Social Psychology کے لیے لکھا تھا۔ یہ ایک بے حد عمدہ تحریر ہے جو قاری کو اخلاقیات پر ہونے والی موجودہ بحث سے روشناس کردے گی۔

ان کے نچوڑ کا مختصر جائزہ پڑھنے کے لیے ہیڈٹ کی کتاب پڑھیے:

"The New Synthesis in Moral Psychology," Science 316 (2007): 998-1002.

جانوروں کی اخلاقیات کی ایک دل موہ لینے والی کتاب یہ ہے:

"Marc Bekoff and Jessica Pierce, Wild Justice: The Moral Lives of Animals (Chicago: University of Chicago Press, 2009)"

پرانا تصور ہے کہ سائنس اور سائنس دان اخلاقیات اور اخلاقی قدروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس تصور کو میرے ایک ہیرو سام ہیرس نے اپنی ایک حالیہ کتاب میں الٹ کر رکھ دیا۔

"The Moral Landscape: How Science Can Determine Human Values (New York:Free Press, 2010)"

وہ کہتے ہیں کہ سائنس، سائنس دان اور نیوروسائنس انسانی اخلاقیات کی تمام جہتوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ییل یونیورسٹی میں پال بلوم Paul Bloom اور ان کے ساتھیوں نے چھوٹے بچوں پر بہت زبردست کام کیا ہے۔ ان کی کتاب دیکھیے:

"Descartes' Baby: How the Science of Child Development Explains What Makes Us Human (New York: Basic Books, 2004)"

اپنے خلاقانہ تجربوں میں انھوں نے تین ماہ تک عمر کے بچوں میں اخلاقی استخراجی نظاموں moral inferential systems کا جائزہ لیا۔

بلوم کے کام پر ایک نظر ڈالنے کے لیے ان کا مقالہ پڑھیے:

"The Moral Life of Babies," New York Times Magazine, May 5, 2010."

سٹینفورڈ یونیورسٹی کے ایک نیورولوجسٹ رابرٹ سیپولسکی نے 2010ء میں

نیویارک ٹائمز کے لیے ایک دلچسپ مضمون لکھا،

"This Is Your Brain on Metaphors"

جس میں انھوں نے بتایا کہ ہمارے اخلاقی نظام اساس جانوروں کے قدیم ردِ عمل پر مبنی ہیں۔ جب ہم سڑا ہوا کھانا سونگھتے ہیں، یا خراب کھانا کھاتے ہیں، یا کسی گھٹیا چور کے بارے میں سوچتے ہیں جس نے ایک بیوہ بڑھیا کو لوٹ لیا ہو تو ہمارے دماغ کے وہی حصے سرگرم ہوتے ہیں۔

خودکش دہشت گردی کی حرکیات اور بھرتی کے لیے خاندان کی نفسیات کو سکاٹ ایٹرین کے عمدہ مضمون پر پڑھا جا سکتا ہے:

"Scott Atran's outstanding "Genesis of Suicide Terrorism," Science 299 (2003): 1534-1539.

"The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 166-172."

Barbara Ehrenreich کی کتاب معلومات افروز کتاب دیکھیے

"Dancing in the Streets: A History of Collective Joy (New York: Henry Holt, 2006)"

ان کا خیال ہے کہ رقص کا ایک مقصد رات کو خطرناک جانوروں کو ڈرا کر بھگانا تھا۔ ان کے مقالے میں ایک خیال افروز نکتہ یہ ہے کہ ہمارے پاس غاروں میں بنائی گئی کئی ایسی تصاویر ہیں جن میں لوگ اکٹھے ناچ رہے ہیں، لیکن ایسی کوئی تصویر نہیں ہے جس میں دو افراد بیٹھ کر بات کر رہے ہوں۔

میرے ایک پسندیدہ نیوروسائنس دان بیری جیکبز ہیں جو پرنسٹن یونیورسٹی میں نفسیات پڑھاتے ہیں۔

سیریٹونن کا ایک کارآمد تعارف ان کے اس مضمون میں دیکھا جا سکتا ہے:

"Serotonin, Motor Activity and Depression-

Related Disorders," American Scientist 82 (1994): 456-463."

مشتاق قاری کے لیے سٹیون سٹال (Stephen Stahl) کی نیوروکیمسٹری اور سائیکوفارماکالوجی پر کتابیں عمدہ تعارف پیش کرتی ہیں۔ انھیں اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری تصاویر سے مدد لے سکتا ہے، جو نیوروکیمسٹری کے آغاز میں دی گئی ہیں، اور بعد میں اپنی ادویات کے بارے میں جان سکتا ہے۔

"Stahl's Essential Psychopharmacology: Neuroscientific Basis and Practical Applications, 3rd ed. (New York: Cambridge University Press, 2008)"

ایک حالیہ مقالے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مذہبی انگیخت کس طرح نامناسب رویے کی سزا کو بڑھا دیتی ہے:

"Ryan McKay, Charles Efferson, Harvey Whitehouse, and Ernst Fehr, "Wrath of God: Religious Primes and Punishment," Proceedings of the Royal Society B, November 24, 2010, http://rspb.royalsocietypublishing.org/content/early/2010/11/17/rspb.2010.2125.abstract?papetoc."

Maurice Apprey ایک سائیکو اینالسٹ ہیں جو افریقہ میں پلے بڑھے، انھوں نے ہمیں یہ کہانی سنائی:

''مغربی افریقہ کے ملک گھانا میں ہمارے چرچ کے ہیڈ ماسٹر مسٹر کولمین تھے، جو آرگن بھی بجاتے تھے۔

وہ بڑی کراہت اور اضطراب سے ہمارے پاس آئے اور مجھے اور میرے ہم جماعتوں کو تفریح کے وقت گیت گانے اور ایک درخت کے گرد ناچنے سے یہ کہہ کر منع کیا:

'رکولڑکو' تمھیں یہ پتا نہیں ہے کہ دیوتا اسی طریقے سے تخلیق کیے جاتے ہیں!؟'

لڑکے حیرت زدہ رہ گئے، انھیں اس خیال سے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ ایک درخت کے گرد گھوم کر دیوتا تخلیق کر سکتے ہیں۔''

"Rodney Needham, "Percussion and Transition," Man 2 (1967): 606-614. "The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 606-614.

Nicholas Wade, in The Faith Instinct: How Religion Evolved and Why It Endures (New York: Penguin Press, 2009)"

میں تین مذاہب کی مشترکہ خصوصیات پر بحث کی گئی ہے: کنگ سان، انڈمان جزیرے والوں کا مذہب اور آسٹریلیا کے ابورجنی باشندوں کا مذہب۔ اس کے علاوہ ان مذاہب کا تقابل افریقہ کے قدیم مذاہب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اگرچہ میں ان کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ مذہب گروپ کی شکل میں اختیار کردہ مطابقت ہے، میں پھر بھی ان کا ممنون ہوں۔

گیت، رقص اور وجد پر مبنی مذاہب کے بارے میں ان کی روداد پڑھ کر مجھے قدیم مذاہب اور ہمارے اجداد کی نیوروکیمسٹری کو استعمال کرنے کی صلاحیت کے درمیان تعلّق کا خیال آیا۔

"Robin Dunbar's "We Believe," New Scientist 189 (2006): 30-33"

نے انڈورفنز اور مذاہب کے جسمانی طور پر تھکا دینے والی رسومات کے درمیان تعلّق کا ذکر کیا ہے۔ میں نے ایک قدم آگے جا کر انڈورفنز، آکسیٹوسین اور مانو امین نیوروٹرانسمٹروں کو مذہب کے آغاز سے ملانے کی کوشش کی ہے۔

"Daniel Dennett's review of Walter Burkett's Creation of the Sacred: Tracks of Biology in Early Religions titled "Appraising Grace: What Evolutionary Good is God?" Sciences (January-February 1997): 39-44"

میں messenger strategy mere کا بہت عمدہ بیان ملتا ہے۔ موسیقی کے ذیلی پیداوار یا جنسی چناؤ والی مطابقت کے بارے میں یہ کتاب دیکھیے:

"Pinker's How the Mind Works, Geoffrey Miller's The Mating Mind: How Sexual Choice Shaped the Evolution of Human Nature (New York: Doubleday, 2000)"

اس کے علاوہ:

"Daniel Levitin's This Is Your Brain On Music: The Science of a Human Obsession (New York: Dutton, 2006)"

Scott Wiltermuth اور Chip Heath نے synchrony اور تعاون کے بارے میں بہت دلچسپ تجربات شائع کروائے ہیں، جن میں لوگوں کو تعاون کے جذبات پیدا کرنے کے لیے بھاری ورزش نہیں کرنا پڑتی بلکہ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی میں حرکت کرنا ہوتی تھی۔ دیکھیے:

"Synchrony and Cooperation," Psychological Science 20 (2009): 1-5."

روبن ڈنبر کے گروپ نے کشتی رانوں کے ساتھ مل کر ایک تجربہ وضع کیا جس سے معلوم ہوا کہ گروپ کی شکل میں مل کر کام کرنے سے انڈورفنز کے مقدار بڑھ جاتی ہے اور درد سہنے کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

"Emma E. A. Cohen, Robin Ejsmond-Frey,

Nicola Knight, and R. I. M. Dunbar, "Rowers' High: Behavioral Synchrony Is Correlated with Elevated Pain Thresholds," Biology Letters, 2009, http://rsbl.royalsocietypublishing.org/content/6/1/106.full."

یونیورسٹی آف ورجینیا کے ایک استاد جیر کون نے خواتین کا خطرناک صورتِ حال میں دماغ کا اس وقت سکین لیا جب ان کا ہاتھ کسی نے نہیں تھاما تھا، جب ان کا ہاتھ ایک اجنبی نے تھاما تھا، اور جب ان کا ہاتھ ان کے شریکِ حیات نے تھاما تھا۔

"ames A. Coan, Hillary S. Schaefer, and Richard J. Davidson,"Lending a Hand: Social Regulation of the Neural Response to Treat," Psychological Science 17 (2006): 1032-1039. "

"The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 1032-1039."

بینیڈک کیری نے نیویارک ٹائمز میں 22 فروری 2010ء کو ایک عمدہ مضمون لکھا،

"Evidence that Little Touches Do Mean So Much"

جس میں لمس اور اس کے اثر پر ہونے والی تحقیق کا خلاصہ بیان کیا گیا تھا۔ مجھے ماہرِ بشریات ہیلن فشر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے، جن کی تحقیق نے محبّت کی نیوروانا ٹمی کا تجزیہ کیا ہے۔ ہم نے مل کر سیریٹونن کی مقدار بڑھانے والے اینٹی ڈیپریسنٹس کے جنسی ذیلی اثرات پر کام کیا ہے،

"Lust, Romance, Attachment: Do the Sexual Side Effects of Serotonin- Enhancing Antidepressants Jeopardize Romantic Love,

Marriage, and Fertility?" Evolutionary Cognitive Neuroscience, ed. Steven Platek (Cambridge, MA: MIT Press 2006)"

خواتین خودکش حملہ آوروں کے بارے میں شیخ یاسین کا بیان باربرا وکٹر کی دستاویزی فلم میں دیکھا جاسکتا ہے:

"Women Suicide Bombers, available on her Web site, and are in her book, Army of Roses: Inside the World of Palestinian Women Suicide Bombers(Emmaus, PA:Rodale, 2003)"

میرے دوست روبن کرام ویل کا کہنا ہے کہ راہب بھی ''عیسیٰ کی دلہنیں'' ہوتے ہیں جنھیں صرف اس کی محبّت کے لیے مختص کر دیا جاتا ہے۔عیسیٰ کی ایک اور شبیہ چرچ کے دولھا کی حیثیت سے ہے۔ نغمے کے نغمے میں شادی کی تمثال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اسرائیل کے لیے خدا کی محبّت اور انسانوں کی آپس میں محبّت سے عبارت ہے۔ ہر عیسائی کسی نہ کسی اعتبار سے عیسیٰ کی دلھن ہے۔حتیٰ کہ مرد بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ عیسائیت نے ہم جنس شادیوں کی توثیق بہت عرصہ پہلے ہی کر دی تھی۔ والدانہ سرمایہ کاری کے تصور کو ذہین ماہرِ حیاتیات رابرٹ ٹریورز نے بیان کیا تھا۔

"Parental Investment and Sexual Selection," in Sexual Selection and the Descent of Man, 1871-1971, ed. Bernard Campbell, 136-179 (Chicago, IL: Aldine, 1972)"

جولیا سوینی کے ڈرامے، جواب ڈی وی ڈی پر دستیاب ہے، کے بارے میں جاننے کے لیے دیکھیے:www.juliasweeney.com/letting_go_mini

مذہب کے طرف سے عورتوں کے استحصال کے باوجود وہ کیوں مذہبی عقائد کو نہ صرف برداشت کرتی ہیں بلکہ ان ترسیل کرتی ہیں؟ اس کے لیے دیکھیے روبن کرام ویل کا

مضمون:

"Why Women Are Bound to Religion: An Evolutionary Perspective,"
http://richarddawkins.net/articles/3609."

2009ء میں ایری زونا کالج کے طلبہ کے ایک مطالعے سے معلوم ہوا کہ مذہبی خیالات اس وقت بڑھ جاتے ہیں جب جنسی ساتھی ڈھونڈنے کے لیے مقابلہ سخت ہو جائے۔

"Yexin J. Li, Adam B. Cohen, Jason Weeden, and Douglas T. Kenrick, "Mating Competitors Increase Religious Beliefs," Journal of Experimental Social Psychology 46 (2010): 428-431.

"The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 428-431."

باب نہم

لون فرینک ایک ڈینش نیوروبایالوجسٹ ہیں اور صحافی ہیں۔ ان کی ایک اہم لیکن نظرانداز شدہ کتاب ہے:

"Mindfield: How Brain Science Is Changing Our World (Oxford: One World Publications, 2009)"

انھوں نے مذہبی ادار کی نیوروسائنس پر ایک عمدہ باب لکھا ہے جس میں انھوں نے Michael Persinger کی تجربہ گاہ جانے اور ''خدائی ہیلمٹ'' خود پہننے کا احوال بیان کیا ہے۔

مائیکل پرسنگر اور اینڈریو نیوبرگ کے ساتھ میری گفتگو کو اس مضمون سے لیا گیا ہے:

"L. S. St-Pierre and Michael A. Persinger, "Experimental Facilitation of the Sensed Presence Is Predicted by Specific Patterns of Applied Magnetic Fields Not by Suggestibility: Re-analyses of 19 Experiments," International Journal of Neuroscience 116 (2006): 1079-1096; Michael A.

Persinger, "Are Our Brains Structured to Avoid Refutations of the Belief in God? An Experimental Study," Religion 39 (2009): 34-42; Andrew Newberg and Mark Robert Waldman, How God Changes Your Brain (New York: Random House, 2009); Sharon Begley,"Religion and the Brain," Newsweek, May 7, 2001; Jack Hitt, "This Is Your Brain on God," Wired 7, No.11 (November 1999); and Constance Holden, "Tongues on the Mind," Science NOW, November 2, 2006.

Persinger, "Are Our Brains Structured to Avoid Refutations of the Belief in God? An Experimental Study," Religion 39 (2009): 34-42; Andrew Newberg and Mark Robert Waldman, How God Changes Your Brain (New York: Random House, 2009); Sharon Begley, "Religion and the Brain," Newsweek, May 7, 2001; Jack Hitt, "This Is Your Brain on God," Wired 7, no. 11 (November 1999); and Constance Holden, "Tongues on the Mind,"

Science NOW, November 2, 2006."

اپنے 2009ء کے مضمون کے اختتام پر ڈاکٹر پرسنگر ہمیں یاد دلاتے ہیں، ''کسی قسم کے خدا پر یقین رکھنا ایک ایسی مطابقتانہ صلاحیت ہے جس پر سائنسی طریقے سے غور نہیں کیا گیا۔ یہ عام مفروضہ کہ متعدد مذہبی تنظیموں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی انسانیت کے لیے فائدہ مند ہے، اس کی کبھی تصدیق نہیں ہوسکی۔

انسانی تاریخ ایسے لوگوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جنھیں صرف اس بنیاد پر کہ وہ ان کے خدا پر یقین نہیں رکھتے، الگ تھلگ کیا گیا، ان کا استحصال ہوا، بلکہ قتل تک کر دیا گیا۔

نیوروادراکی عمل (neurocognitive processes) اور نیوروانا ٹومیکل راستوں (neuroanatomical pathways) کو علاحدہ کیا جا سکتا ہے، انھیں کنٹرول کیا جا سکتا ہے، اور خدا پر یقین کو ممکنہ خطرناک انسانی رویوں کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔'' Kapogiannis اور ان کے ساتھیوں نے عام مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں کے دماغ کی امیجنگ کی۔

"Dimitrios Kapogiannis, Aron K. Barbey, Michael Su, Giovanna Zamboni, Frank Krueger, and Jordan Grafman, "Cognitive and Neural Foundations of Religious Belief," Proceedings of the National Academy of Science 106 (2009): 4876-4881."

یہ مطالعہ سائنس کی سیاست پر فتح کی اعلیٰ مثال ہے۔

یہ تحقیق نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ہیلتھ کی طرف سے قدامت پرست بش انتظامیہ کے آخری برسوں میں کی گئی۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر 2008ء کے امریکی انتخابات کا نتیجہ مختلف آیا ہوتا تو کیا یہ تحقیق شائع ہوسکتی۔

سیم ہیرس، جن کی کتابیں، The End of Faith, Letter to a Christian Nation اور The Moral Landscape سے انھیں ایک توانا مذہب مخالف کی حیثیت سے بہت زیادہ توجہ ملی ہے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ ایک نیوروسائنس دان بھی ہیں۔

مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں کی امیجنگ پر ان کی تحقیق 2009ء میں شائع ہوئی تھی۔

> "Sam Harris, Jonas T. Kaplan, Ashley Curiel, Susan Y. Bookheimer, Marco Jacoboni, and Mark S. Cohen, "The Neural Correlates of Religious and Nonreligious Belief," PLoS One 4, no. 10: e7272."

ماحول، تقویٰ، اور طفیلیے:

انسانیت پر مذہب اور مذہبی اثرات کے بارے میں دو اور دلچسپ سائنسی مطالعے بھی شائع کیے گئے ہیں جن پر شاید پہلے غور نہیں کیا گیا تھا۔

2005ء میں مختلف ثقافتوں کے بشریاتی اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے سٹینفرڈ یونیورسٹی کے بیالوجی اور نیورولوجی کے پروفیسر رابرٹ ایم سیپولسکی Sapolsky نے یہ معلومات ڈھونڈ نکالیں کہ مذہبی خیالات کی تشکیل میں جغرافیے اور ماحولیات کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے برساتی جنگلوں میں رہنے والے کثیر پرست ہوتے ہیں، فطری مظاہر پر مبنی روحوں پر یقین رکھتے ہیں، اور اس بات پر کم ایقان رکھتے ہیں کہ دیوتا ان کی زندگیوں میں مداخلت کرتے ہیں۔ صحرا میں رہنے والے کٹھن اور یک رنگ زندگی گزارتے ہیں، اور وہ عام طور پر ایک کٹھن، زن بیزار (misogynistic) اور زندگیوں میں مداخلت کرنے والے خدا پر یقین رکھتے ہیں۔

مختلف وجوہات کے باعث یہ صحرا میں رہنے والا خدا ہے جو انسانیت کے بڑے حصے تک پہنچا ہے۔ ان کی کتاب دیکھیے:

"Monkeyluv: And Other Essays on Our Lives as Animals (New York: Scribner, 2005)"

2008ء میں یونیورسٹی آف نیومیکسیکو میں کیے جانے والے ایک مطالعے سے ظاہر ہوا کہ متعدی بیماریاں، خاص طور پر وہ جو ایک انسان سے دوسرے انسان کو لگتی ہیں، بھی لوگوں کی مذہبیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مختصراً یہ کہ مذہب صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔

کیوں؟

مذہب نظریۂ اجتماعیت کو فروغ دیتا ہے، یعنی میں، بمقابلہ تم اور تمھارے ساتھی۔ وہ علاقے جہاں انسان سے انسان تک پھیلنے والی بیماریوں کی شرح سب سے زیادہ ہے، وہ سب سے مذہبی علاقے ہیں۔

"Corey L. Fincher and Randy Thornhill, "Assortative Sociality, Limited Dispersal, Infectious Disease and the Genesis of the Global Pattern of Religion Diversity," Proceedings of the Royal Society B 275 (2008): 2587-2594.

"The Cognitive Psychology of Belief in the Supernatural," in American Scientist 92 (2006): 2587-2594."

یہ بات کہ ہمارے دماغ اپنی تشکیل کے لحاظ سے اخلاقی ہی Joshua Greene کے اس مضمون سے لی گئی ہے:

"Fruit Flies of the Moral Mind," in What's Next: Dispatches on the Future of Science, ed. Max Brockman."

باب دہم

چارلز ڈارون کے پڑپوتے میتھیو چیپ مین نے سکوپس ٹرائل کے بارے میں ذاتی تاثرات لکھے ہیں:

> "Trials of the Monkey: An Accidental Memoir (New York: Picador, 2000) and the Dover trial, 40 Days and 40 Nights (New York: Harper Collins, 2007)"

براؤن یونیورسٹی کے ماہرِ حیاتیات اور مصنّف کینیتھ ملر نے ڈوور کے مقدمے میں یہ شہادت دی:

سوال: کیا ارتقا مذہب کے خلاف ہے؟

جواب: میں ایسا نہیں سمجھتا اور اس موضوع پر میں نے پوری کتاب لکھی ہے۔

سوال: کیا بعض سائنس دان اپنے دلائل میں ارتقا کو لے آتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ارتقا مذہب کے خلاف ہے، اور خدا کے خلاف ہے؟

جواب: جی ہاں، میں کئی ممتاز ارتقائی ماہرینِ حیاتیات کا ذکر کر سکتا ہوں، جیسے رچرڈ ڈاکنز، یا ڈینیئل ڈینیٹ یا ولیم پیلے جیسے فلسفی جنھوں نے ارتقا کے بارے میں لکھا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ہر لفظ جو کسی سائنس دان کے منھ سے نکلتا ہے، سائنس نہیں ہوتا۔ اور ہر لفظ جو کوئی ارتقائی نظریے کے بابت کہتا ہے، لازمی نہیں کہ وہ سائنسی ہو۔

مثال کے طور پر رچرڈ ڈاکنز نے بڑی صفائی سے کہا ہے کہ ان کے لیے زندگی اور اس کی ابتدا کو سمجھنا ایک مادی وسیلہ ہے جو انھیں کسی آفاقی ہستی پر یقین رکھنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ میں آیا میں ڈاکنز کی طرح سلاست سے بات کر سکتا ہوں یا نہیں، لیکن میں نے اس موضوع پر سخت محنت کی ہے۔ میرے لیے یہ خیال کہ ہم اس سیارے

پر تمام مخلوقات کے ساتھ ہستی کی ایک عظیم زنجیر میں بندھے ہیں، میرے آفاقی عقیدے کو مزید گہرا کرتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب میں چرچ جاتا ہوں تو میں اس حیرت انگیز اور پرنعمت دنیا کے لیے خالق کا شکر ادا کرتا ہوں، اور ساتھ ہی ارتقا کا بھی جس نے اس قدر حسن کو جنم دیا ہے اور ہمارے اردگرد اس قدر تنوع پیدا کیا ہے۔ یہ میرے خیالات ہیں، جیسے ڈاکنز کے اپنے خیالات ہیں۔ لیکن میں سائنسی انداز میں بات نہیں کر رہا، اور نہ ہی میں بطور سائنس دان بول رہا ہوں، اور میرے خیال سے یہ فرق نہایت اہم ہے۔

سوال: سو آپ نے مذہب اور سائنس کے درمیان اس تقابل پر پوری کتاب لکھی ہے؟

جواب: جی ہاں۔۔۔ میں بہت شدت سے یہ سمجھتا ہوں، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے خیالات نہ تو سائنس ہیں اور نہ سائنسی۔

میں یہ بتاتا چلوں کہ میرے شریک مصنّف جوزف لیوائن بھی ایک مذہبی شخص ہیں، اور ان کے مذہب کے بارے میں خیالات اور عقائد مجھ سے مختلف ہیں۔ میں اور وہ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا ہمارے مختلف مذہبی عقائد کے ساتھ پوری طور سے ہم آہنگ ہے، لیکن ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہمارے مذہبی عقائد سائنسی نہیں ہیں، اور وہ فلسفیانہ، مذہبی اور ذاتی خیالات ہیں، اور ان کی کسی سائنسی نصاب یا کتاب میں جگہ نہیں بنتی۔

جان ای جونز Kitzmiller v. Dover Area School District کے مقدمے میں کہتے ہیں: ''مدعا علیہان اور عاقل تخلیق پر یقین رکھنے والے بہت سے افراد ایک بنیادی مفروضے پر یقین رکھتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ ان کا مفروضہ یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا مذہب اور خدا کے خلاف ہے۔ اس مقدمے میں مدعی کے سائنسی مشیروں نے بار بار شہادت دی ہے کہ نظریہ ارتقا اچھی سائنس کی نمائندگی کرتا ہے، اسے سائنسی برادری نے بڑے پیمانے پر تسلیم کر لیا ہے اور یہ کسی بھی طرح خدا کے وجود کی تردید نہیں کرتا۔''

سائنس اور مذہب کے درمیان فرق پر Jerry Coyne کا پرمغز خلاصہ یہاں

ملتا ہے:

> "In religion faith is a virtue; in science it's a vice," comes from "Science and Religion Aren't Friends," a column in the October 11, 2010, edition of USA Today."

ہر قسم کے بنیاد پرست قتل، زن بیزاری، شہری حقوق کی پامالی، زندگی بچانے والی تحقیق پر پابندی، اور بچوں کی مذہبی تعلیم دینے کا پرچار کرتے ہیں۔

کیا دنیا کبھی بھی مذہب کے ڈراونے خواب سے جاگے گی؟

عیسائی بنیاد پرست، جہادی، تخلیق پر یقین رکھنے والے، اور ''عاقل تخلیق'' کے نظریہ ساز سب کے سب جدید الیکٹرانک آلات استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ یہ بات جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں کہ یہ وہی سائنس ہے جو موبائل فون اور کمپیوٹروں میں کارفرما ہے، یہی سائنس بتاتی ہے کہ کائنات کیسے چل رہی ہے۔

جدید الیکٹرانکس اسی سائنس کا حصہ ہے جو قدرتی چناؤ کی تصدیق کرتی ہے اور ہماری بندروں اور ابتدائی انسان نما جانوروں سے ارتقا پانے کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ اس میں کسی آفاقی مداخلت، چھ ہزار سال پرانی زمین کے نظریے، یا ایک ہفتے میں بنائی جانے والی دنیا کی گنجائش نہیں ہے۔

Tim Folger نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا:

> "The Best American Science and Nature Writing 2004 (New York: Houghton Mifflin, 2004)"

مصنّف کا نوٹ

اگر اس مختصر کتاب سے آپ کے اندر مذہب کے بارے میں نئی بحثوں سے تحریک ملی ہو تو آپ کو مندرجہ ذیل سے بھی لطف اندوز ہوں گے:

"www.richarddawkins.net Ayaan Hirsi Ali, Infidel (2007) and Nomad (2010) Richard Dawkins, The God Delusion (2006) Daniel Dennett, Breaking the Spell (2006) Sam Harris, The End of Faith (2004) Letter to a Christian Nation (2006), and The Moral Landscape (2010) Christopher Hitchens, God Is Not Great (2007) and The Portable Atheist (2007)"

فرہنگ

مندرجہ ذیل ہمارے ذہنوں کے وہ بنیادی عوامل ہیں جو مل کر ہمیں مذہبی عقائد دیتے ہیں۔

وابستگی:۔ وہ بنیادی انسانی ضرورت جو قریب قریب مذہب کے مسئلے کی تعریف بیان کرتی ہے۔ مذہب خاندان کو تقویت دیتا ہے یا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

بچگانہ زود اعتقادی:۔ ہم سب بہت کم شواہد کے باوجود بھی یقین لے آتے ہیں۔ بچے اور بھی زد پذیر ہوتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب انھیں کوئی مقتدر شخص پڑھائے۔

مہنگا اشارہ:۔ کوئی شخص جو اپنی کمر پر کوڑے برسا کر اس کا قیمہ کر دینے پر تلا ہوا ہے، جو اپنے مذہب پر سختی سے کاربند ہوگا اور اگر میں ایمان لے آؤں تو وہ میرا حمایتی بن جائے گا۔

دولخت ادراک:۔ اس سے ہمیں اپنے ذہنوں کے اندر ایک ان دیکھے شخص کے ساتھ پیچیدہ سماجی تعامل میں مدد ملتی ہے۔

مقتدرہ کے لیے التوا:۔ ہم سب مقتدر شخصیات کا احترام کرتے ہیں، چاہے ہم اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔

خواب۔ انھیں ایک اور دنیا، اور آبا کے وجود کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ فعال عامل کی تلاش۔ اس سے ہمیں ان دیکھی قوتوں اور انسانی عوامل فرض کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ اس کا ارتقا ہمیں تحفّظ فراہم کرنے کے لیے ہوا۔ ہم سائے کو چور سمجھ لیتے ہیں اور چور کو سایہ۔ اس سے تجسیمیت (anthropomorphism) کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

رشتے داری نفسیات۔ ہمارے جینز میں اپنے رشتے داروں کو دوسروں پر ترجیح دینا لکھا ہوا ہے۔

ارادیت:۔ اس سے ہمیں اپنے خیالات، خواہشات، عقائد اور نیتوں کے ضمن میں دوسروں کے خیالات کے بارے میں قیاس آرائی کرنے میں مدد ملتی ہے۔

وجدانی استدلال:۔ اس سے ہمیں منطق کے ذریعے ''خالی جگہیں پر کرنے'' میں مدد ملتی ہے۔

ذہن اور جسم کی دوئی:۔ اس سے ہمیں ذہن اور جسم کو الگ کر کے ''روح'' پر یقین رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

کم سے کم خلافِ توقع دنیائیں:۔ اس سے مافوق الفطرت پر یقین رکھنے میں مدد ملتی ہے، بشرطیکہ یہ ضرورت سے زیادہ بڑھ کر نہ ہو اور انسانیت کے زیادہ بنیادی اصولوں کو مسخ نہ کرتا ہو۔

آئینہ نیوران:۔ ہم دوسروں کا درد محسوس کرتے ہیں۔ یہ پیدائشی عمل ہے، نہ کہ مذہب کا تخلیق کردہ۔ ہم پیدائشی طور ہمدرد ہیں۔

اخلاقی محسوساتی نظام:۔ ان سے ہمارے اخلاقی فیصلے جنم لیتے ہیں۔ یہ خودکار اور جبلتی ہیں۔ کیوں کہ یہ ہمارے شعور سے باہر کارفرما ہوتے ہیں، مذہب ان کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے اور یہ اصرار کر سکتا ہے کہ صرف مذہب ہی

ہمیں اخلاقیات سکھاتا ہے۔

حفاظتی استدلال:۔ احتیاط شرط ہے۔

مخلوط غایات:۔ (promiscuous teleology) یہ ہمارے اس تعصّب سے جنم لیتی ہے جس میں ہم دنیا کو مقصدیت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

جوابی ایثاریت:۔ (reciprocal altruism) آپ میری پیٹھ کھجلائیں۔ میں آپ کی پیٹھ کھجلاؤں گا۔

رسومیاتی رویہ:۔ اس سے گروہی پیوستگی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس بات کا امتحان ہوتا ہے کہ کون گروہ کے ساتھ زیادہ وابستہ ہے۔

رومانوی محبّت:۔ لوگ عیسیٰ، یا کسی بھی دوسری مذہبی ہستی کی محبّت میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور انھی ذہنی خصوصیات کو بروئے کار لاتے ہیں جو وابستگی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

رقص ونغمہ:۔ یہ ہماری نیوروکیمسٹری کی ان خصوصیات کا استعمال کرتی ہیں جو درد اور خوف کو کم کرنے میں مدد دیتی ہیں اور اعتماد، محبّت، خود اعتمادی اور تعاون میں اضافہ کرتی ہیں۔

نظریہ ذہن:۔ اس سے ہمیں دوسروں کے ممکنہ خیالات، خواہشات، عقائد، اور ارادوں کو ''پڑھنے'' میں مدد ملتی ہے۔

منتقلیِ جذبات:۔ ہم مذہبی ہستیوں کو اتنی ہی آسانی سے قبول کر سکتے جس طرح ہم خاندان کے افراد کو قبول کرتے ہیں جنھیں ہم بچپن سے جانتے ہیں۔ ہم اپنے خاندانی خیالات کو مذہبی شخصیات تک منتقل کر دیتے ہیں۔

●●●